بسم اللہ الرحمن الرحیم

خلافتِ اسلامیہ

اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : خلافتِ اسلامیہ اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد

محاضرات : مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

مرتبین : مولانا حافظ کامران حیدر

ناصر الدین خان عامر

مجموعہ : مارچ ۲۰۲۴ء

ناشر :

اشاعت :

فہرست

☆ پیش لفظ...9

خلافتِ اسلامیہ

☆ خلافت کا تصور اور تاریخی پس منظر.................................12
- خلافتِ تکوینی.................................12
- خلافتِ تشریعی.................................13
- تاریخی پس منظر.................................16
  - o انبیاء کرامؑ کے بعد خلفاء کی ذمہ داری.................................21
  - o نیابت اللہ کی، یا رسول اللہ کی؟.................................21

☆ خلافت اور امامت.................................24
- خلافت اور امامت کا بنیادی فرق.................................24
- اہلِ تشیع کے ہاں امامت کا تصور.................................26

☆ خلافت اور پاپائیت.................................28
- پاپائیت کا پس منظر.................................28
- مغرب کی مذہب بیزاری کا سبب.................................29
- خلافت، دلیل کی حکومت.................................30
- اینڈ آف دی ہسٹری کون؟.................................30

☆ خلافت کا سیاسی نظام 32
- امت کا اجتماعی فریضہ 32
- انعقادِ خلافت کی صورتیں 33
  - o امت کی اجتماعی صوابدید 33
  - o خلیفۂ وقت کی طرف سے براہ راست نامزدگی 35
  - o خلیفۂ وقت کی منتخب کردہ شخصیات میں سے انتخاب 35
  - o اصحابِ شوریٰ کی طرف سے نامزدگی 35
  - o اقتدار پر قبضہ کی عام قبولیت 35
  - o دورِ حاضر میں قیامِ خلافت کی صورتیں 36
- خلافت میں فیصلوں کی بنیاد 37
  - o شیخینؓ کے دو خطبے 37
  - o حضرت ابو بکرؓ کے فیصلوں کی بنیاد 37
  - o حضرت عمرؓ کے فیصلوں کی بنیاد 40
- عوام کا حقِ احتساب 41
  - o حضرت عمرؓ کے کرتے کا معاملہ 41
  - o حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قصہ 42
  - o حضرت عثمانؓ کی کھلی کچہری 43
  - o حضرت معاویہؓ کا رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ 44
  - o حضرت معاویہؓ کا بیت المال کے متعلق اعلان 45

☆ خلافت کے معیارات 48
- مثالی طرزِ حکومت 48
- معیاری طرزِ حکومت 49
- جوازی طرزِ حکومت 51

• حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی اصلاحات 51

☆ خلافت کا رِفاہی تصور اور نظم 60

• رفاہی ریاست کا نقطۂ آغاز 61

• بیت المال اور اس کی آمدنی و مصارف 62

o سفر کی سواری 62

o کفارہ کی ادائیگی 64

o دیت کی ادائیگی 65

o عید الاضحیٰ کی قربانی 65

• رفاہی ریاست کا نظم 66

o خلیفۂ وقت کے روزگار کا معاملہ 66

o سرکاری اموال کی تقسیم پر حضرات شیخینؓ کا طرزِ عمل 68

o برابری اور ترجیح کی تقسیم میں ریاست کی صوابدید 71

• رفاہی ریاست کی ذمہ داری 71

o حضرت عمرؓ کا رات کا گشت 72

o بوڑھے یہودی کا واقعہ 73

o بچوں کا وظیفہ 74

• اسلامی نظام کی برکات 75

o نبی کریمؐ کی پیشگوئی اور حضرت عدیؓ کا مشاہدہ 76

o حضرت معاذ بن جبلؓ کے دور میں یمن کا سالانہ میزانیہ 78

o کسریٰ کے کنگن 79

o قیصرِ روم کا تحفہ 81

o حضرت عمرؓ اور زیتون کا تیل 81

o حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا دورِ خلافت 82

• دورِ حاضر میں رفاہی ریاست کا تصور 84

☆ خلافت کے ادوار 88

• خلافتِ بنواُمیہ 88

• خلافتِ بنوعباس 89

• اندلس میں مسلم حکومت 91

o ہماری سیاسی تاریخ کے دو پہلو 91

o مسلم تہذیب و تمدن کا عروج 93

• خلافتِ عثمانیہ 98

o سقوطِ خلافتِ عثمانیہ 100

o اسرائیل کے قیام کا منصوبہ 100

o خلافت اور شریعت کے خاتمہ کا عالمگیر معاہدہ؟ 103

o برصغیر کی تحریکِ خلافت 106

• قیامِ خلافت کا فریضہ اور موجودہ جدوجہد 111

پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد

☆ قیامِ پاکستان اور دستور سازی 116

• اسلامی یا سیکولر ریاست؟ 116

• نظامِ حکومت کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ 118

o ''قراردادِ مقاصد'': نظامِ مملکت کی تین بنیادیں 119

o نفاذِ اسلام کیلئے غیر مسلم رہنماؤں کا کردار 120

• مگر کونسا اسلام؟ 121

o ۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء کے بائیس نکات 121

o ۲۰۱۱ء میں ستاون علماء کے سینتیس نکات 123

☆ مذہب اور ریاست کا باہمی تعلق............124
• سعودی عرب کا حکومتی نظم............124
• ایران کا دستوری نظم............124
• پاکستان کا دستوری نظم............125
• ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق کے تین رجحانات............126
☆ قادیانی مسئلہ............129
• مرتد کی سزا کی بحث............129
• علامہ محمد اقبالؒ اور قادیانیت............130
• ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت............131
☆ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر............133
• قومی سیاست کی تکون............133
• ۱۹۵۶ء کا دستور............134
• ۱۹۶۲ء کا دستور............135
☆ نفاذِ اسلام اور پارلیمنٹ............136
• پارلیمنٹ کیلئے شریعت کی تعبیر وتشریح کا اختیار............136
• اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت............137
• آج کا اسلوب اور ہمارے علماء کرام............139
☆ نفاذِ اسلام اور عدلیہ............142
• دستور میں قراردادِ مقاصد کی بالادستی کا معاملہ............142
• قرآن وسنت یا انسانی حقوق کا چارٹر؟............143
• وفاقی شرعی عدالت اور اس کا اختیار............144
☆ نفاذِ اسلام کی جدوجہد............146
• تاجِ برطانیہ کے دور میں علاقائی ریاستوں کی حیثیت............146

• ۱۹۳۵ء کا شریعت بل 147
• پاکستان سے ملحق ریاستیں اور ان کا عدالتی نظام 149
• ۱۹۸۷ء کا شریعت بل 151
o تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا معاملہ 152
o پارلیمنٹ کی رکنیت کی اہلیت کا مسئلہ 154
o پارلیمنٹ کیلئے حقِ اجتہاد کا مطالبہ 155
o حقِ اجتہاد اور طرفین کے موقف 157
o شریعت بل کی منظوری کے مراحل 158
• سودی نظام کے خلاف جدوجہد 161
☆ چند سوالات اور جوابات 164

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

امتِ مسلمہ کی خود مختاری اور آزادانہ حیثیت کے ساتھ وحدت و ہم آہنگی اور مسلم معاشروں میں قرآن و سنت کے احکام کی عملداری اس وقت ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی ضرورت ہے، جس کے لیے عالمِ اسلام کے مختلف حلقوں میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں گروہ اپنے اپنے انداز میں جدوجہد کر رہے ہیں، اور ان کے اہداف میں خلافت کی بحالی کے علاوہ معاشی استحکام و آزادی، نفاذِ شریعت اور مسلم تہذیب و ثقافت کا تحفظ شامل ہیں۔ اس مقصد کے لیے انسانی سماج کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مسلم خلافتوں اور حکومتوں کے ماضی کے کردار، موجودہ عالمی اور ملی صورتحال، اور حال و مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آگاہی لازمی امر کی حیثیت رکھتی ہے۔

راقم الحروف گزشتہ چھ عشروں سے ایک فکری و عملی کارکن کے طور پر کچھ نہ کچھ خدمت سرانجام دیتا آ رہا ہے اور اس دور کی سیاسی و علمی تحریکات کا حصہ رہا ہے۔ اس دوران خطبات و بیانات کے ساتھ ساتھ اخبارات و جرائد میں مسلسل لکھتے رہنا بھی میری تگ و دو کا اہم حصہ رہا ہے اور یہ بیانات و مضامین کم و بیش نصف صدی کے اخبارات و جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں، جنہیں جمع و محفوظ کرنے میں ہمارے فاضل عزیز مولانا حافظ کامران حیدر (فاضل جامعہ نصرۃ العلوم) اور میرے عزیز فرزند ناصر الدین خان عامر ایک عرصہ سے پورے ذوق و محنت کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ بہت سا کام کر چکے ہیں جو مختلف عنوانات کے ساتھ مرتب کتابوں کی صورت میں اصحاب ذوق کی تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ خلافتِ اسلامیہ کے تاریخی پس منظر اور مستقبل کے امکانات اور پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے بارے میں زیر نظر مجموعہ بھی انہی کی کاوش اور ذوق و سلیقہ کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت سے نوازیں اور ملتِ اسلامیہ کے لیے نفع بخش بنا دیں، آمین یا رب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۱۶ مارچ ۲۰۲۴ء

خلافتِ اسلامیہ

خلافت کا تصور اور تاریخی پس منظر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں ایک اہم موضوع پر بات کرنا چاہوں گا کہ خلافتِ اسلامیہ کیا ہے؟ خلافت کا شرعی تصور کیا ہے؟ اس کی علمی اور فکری بنیادیں کیا ہیں؟ تاریخ کا تناظر کیا ہے؟ اور خلافت کے مسئلہ پر ہمارا دنیا کے ساتھ جو تنازع ہے، اس میں ہمارا موقف کیا ہے اور دنیا کا موقف کیا ہے؟ ہماری کشمکش کس میدان میں ہے اور کیسے آگے بڑھ رہی ہے؟ اس سارے تناظر کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔

خلافت کا لفظی معنیٰ تو نیابت ہے۔ کوئی بھی اتھارٹی اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے لیے یا اپنا کام کرنے کے لیے کسی کو نائب بنادے کہ میری طرف سے تم کر دو، تو یہ خلافت اور نیابت ہے۔ اللہ رب العزت نے زمین پر انسان کو خلافت دی ہے اور انسان کو خلیفہ کا خطاب اور ٹائٹل دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے سے پہلے فرشتوں سے ذکر کیا کہ میں دنیا میں خلیفہ بنانے لگا ہوں۔ اس خلیفہ کے کئی معنی مفسرین بیان فرماتے ہیں۔ ایک تو نسلِ انسانی بطور خلیفہ کے ہے۔ اور اس معنیٰ میں بھی ہے کہ ہم سے پہلے اس زمین پر بسنے والے ہمارے پیشرو جن تھے، اب ان کی جگہ انسان ہیں، تو ہم زمین پر جنوں کے بعد خلیفہ ہیں، ان کے بعد آنے والے ہیں۔

خلافت کا جو معنیٰ اللہ تعالیٰ کی نیابت بیان کیا جاتا ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، وہ دو حوالوں سے ہے۔ ایک خلافتِ تکوینی ہے، دوسری خلافتِ تشریعی ہے۔ ایک خلافتِ ارضی ہے اور دوسری خلافتِ شرعی ہے۔ دونوں کا اپنا اپنا دائرہ ہے۔

خلافتِ تکوینی

خلافتِ تکوینی اور خلافتِ ارضی یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے زمین کا نظام اور زمین کا کنٹرول انسان کے حوالے کیا ہوا ہے۔ زمین پر ہزاروں نہیں لاکھوں قسم کے جانور رہتے ہیں، ہم سے چھوٹے بھی اور بڑے بھی، ہم سے کمزور بھی اور زیادہ طاقتور بھی، لیکن زمین کے نظام کو صرف انسان ہی چلا رہا

ہے۔ زمین پر اور اس کے اندر، فضا میں، سمندر اور اس کی تہہ میں انسان کا تصرف ہے۔ زمین، فضا اور سمندر کے نظام میں اگر کسی کا عمل دخل ہے تو وہ انسان کا ہے۔

زمین سے پیداوار کا حصول، زمین میں کانٹ چھانٹ جو کچھ بھی کر رہا ہے انسان ہی کر رہا ہے۔ انسان زمین میں کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس میں گہرائی کر کے اس سے پانی، سونا اور گیس نکالتا ہے۔ ہوائی جہاز چلاتا ہے اور ہوا میں اڑتا ہے، پانی میں کشتیاں چلاتا ہے اور اس میں سے موتی نکالتا ہے۔ جو کام انسان زمین کے ساتھ کر رہا ہے، نہ یہ شیر کے بس کی بات ہے اور نہ ہاتھی کے بس کی بات ہے، ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ زمین کے اندر اور اوپر، سمندر کے اوپر اور اس کی تہ میں، اور فضا میں انسان ہی تصرفات کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی، صلاحیت دی اور تصرف کے مواقع دیے، بلکہ اللہ تعالیٰ نت نئے مواقع پیدا کرتے رہتے ہیں۔ سائنس یہی ہے، زمین کے ماحول کو سمجھنا، اس کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا۔

انسان کی صلاحیت پر میں چھوٹی سی مثال دیا کرتا ہوں۔ اونٹ انسان سے جسامت اور طاقت میں بڑا ہے لیکن ستر اونٹوں کی قطار چل رہی ہوگی، ایک دوسرے کی دم سے بندھے ہوئے جا رہے ہوں گے، اور ان کی نکیل ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہوگی۔ انسان بحیثیت انسان زمین اور اس کے متعلقات کے نظام میں عمل دخل بھی رکھتا ہے اور بہت سے معاملات میں انسان کو کنٹرول بھی حاصل ہے۔ بلکہ اب تو انسان نے زمین سے باہر بھی دخل دینا شروع کر دیا ہے، دیگر سیاروں پر بھی جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ انسان کی تکوینی خلافت کا ایک پہلو ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔

خلافتِ تشریعی

خلافتِ تشریعی یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے احکام پر عملدرآمد کے لیے ہمیں ذمہ داری سونپی ہے کہ ہم اللہ کے قانون کو، اس کے نظام کو اس کی زمین پر قائم کریں۔ اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا۔ خلافتِ شرعیہ کا تصور کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے جب نسلِ انسانی کو زمین پر آباد کرنے کا آغاز کیا تو سب سے پہلے دو افراد کو بھیجا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام۔ سب سے پہلے دنیا میں یہ جوڑا بھیجا گیا۔

یہ الگ ضمنی بحث ہے کہ سوسائٹی کی بنیاد فرد پر ہے یا خاندان پر ہے۔ ہمارا مغرب کے ساتھ ایک فکری تنازع چلتا ہے۔ مغرب کہتا ہے کہ فرد بنیاد ہے، وہ اس کو انڈویجولزم کہتے ہیں کہ فرد پر ہی ساری

سوسائٹی کے معاملات کا مدار ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ معاشرہ کی بنیاد فرد پر نہیں بلکہ خاندان پر ہے، سوسائٹی کا بنیادی یونٹ فیملی ہے کیونکہ اللہ رب العزت نے زمین پر سب سے پہلے فرد نہیں بلکہ ایک جوڑا اتارا تھا۔ مغرب کے اس موقف کے تناظر میں کہ فردیت، فرد کی آزادی، اور فرد ہی سب کچھ ہے، اس پر میں نے اپنا اصولی موقف عرض کیا ہے کہ فرد بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔

جب اللہ رب العزت نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو دنیا میں بھیجا تو ہمیں پہلے دن سے دو باتیں واضح فرما دی تھیں، جو قرآن مجید میں مذکور ہیں:

اللہ تعالیٰ نے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی قلنا اھبطوا منھا جمیعا (البقرہ ۳۸) اتر جاؤ زمین پر، تم دونوں میاں بیوی بھی اور تمہارے ضمن میں جو بھی نسلِ انسانی ہے وہ بھی۔ ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین (الاعراف ۲۴) تمہارے لیے زمین پر مستقر بھی ہوگا اور متاع بھی ہوگا۔ روٹی، کپڑا، مکان ملے گا، لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ لمیٹڈ ہوگا۔ ایک بات تو یہ فرمائی کہ زمین میں قرار گاہ بھی ہوگی، متاع اور زندگی کے اسباب بھی ملیں گے لیکن یہ اَن لمیٹڈ نہیں ہوگا بلکہ لمیٹڈ ہوگا۔ الیٰ حین ایک وقت تک ہوگا۔ فرد کا حین پچاس، ساٹھ، ستر، اسی سال ہے۔ قرن یعنی زمانے کا حین ایک صدی۔ نسلِ انسانی کا اجتماعی حین چودہ پندرہ ہزار سال ہے قیامت تک۔ اللہ رب العزت نے وقت متعیّن کیا ہوا ہے لیکن بتایا کسی کو نہیں ہے۔ انسانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے یہاں آئے ہیں، یہاں کچھ وقت گزاریں گے، پھر ان کی اللہ رب العزت کے ہاں واپسی ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ ۳۸) کہ زمین پر رہنے کے لیے ہدایات میری طرف سے آئیں گی۔ زمین پر کون سے کام کرنے ہیں، کون سے کام نہیں کرنے، زندگی کیسے گزارنی ہے، یہ ہدایات میری طرف سے آتی رہیں گی، جس نے میری ہدایات کی پیروی کی وہ خوف اور غم سے نجات پائے گا۔ اس لیے انسان زمین پر رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا پابند ہے اور ہماری نجات اور فلاح کا مدار ھدًی کی پیروی میں ہے۔ وہ ہدایات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ السلام کے ذریعے آتی رہیں، وہ ان ہدایات کو پہنچاتے بھی تھے، اور جہاں اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ اقتدار بھی دیا وہاں وہ ان احکامات کو نافذ بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق (ص ۲۶) کہ آپ نے لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرنے ہیں۔ اس

موقع پر انسان کو زمین پر اتارتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ بعضکم لبعض عدو تمہارے درمیان باہمی کشمکش اور دشمنی بھی چلتی رہے گی۔

چنانچہ انسانی سوسائٹی تک اللہ کے احکام پہنچانا اور ان کو نافذ کرنا خلافتِ شرعی ہے۔ خلافت شرعیہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت سوسائٹی پابند ہیں کہ اللہ رب العزت کے اُن احکام اور ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں جو اللہ کے رسولوں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ یہ خلافت کی علمی وفکری اور منطقی بنیاد ہے۔

خلافت کا یہ تصور کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی میں زندگی گزارنے کے پابند ہیں، یا اپنی مرضی بھی کر سکتے ہیں؟ اس پر کشمکش حضرت آدمؑ کے بعد ان کے بیٹوں ہابیل اور قابیل سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ہابیل نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلہ کیا کہ جو اللہ کا حکم اور قانون ہے میں اس کے مطابق چلوں گا۔ جبکہ قابیل نے اپنی مرضی اور خواہش کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ بھائی کو قتل کر دیا بلکہ اس بات کا آغاز کیا کہ میں اپنی مرضی سے چلوں گا۔ وہاں سے جو کشمکش شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے آج دنیا کی ساڑھے سات ارب سے زائد انسانوں کی سوسائٹی دو واضح حصوں میں تقسیم ہے۔

انسانی سوسائٹی میں دو بنیادی فکر پائے جاتے ہیں، تب بھی تھے، آج بھی ہیں۔ آج کی اصطلاح میں ایک کو بلیورز کہتے ہیں اور ایک کو نان بلیورز کہتے ہیں:

- وہ انسان جو اللہ تعالیٰ، آخرت اور آسمانی ہدایات کو کسی بھی درجے میں مانتے ہیں، وہ بلیورز کہلاتے ہیں، جو جوابدہی کے تصور، آسمانی تعلیمات اور وحی پر یقین رکھتے ہیں۔ ان میں مختلف مذاہب ہیں، یہودی، عیسائی، مسلمان اور ہندو وغیرہ، ان کی مختلف تعبیرات اور تشریحات ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ خدا، آخرت اور آسمانی تعلیمات کو ماننے والے ہیں۔ خلافت کا تصور ان لوگوں کا ہے جو آسمانی تعلیمات کو مانتے ہیں اور قیامت، جنت، دوزخ اور جزا و سزا پر یقین رکھتے ہیں۔
- اور وہ جو اللہ تعالیٰ، آسمانی تعلیمات اور آخرت کی زندگی کو نہیں مانتے، وہ نان بلیورز کہلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے فیصلے خود کریں گے، فرد بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہے اور سوسائٹی بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہے۔ آج دنیا میں مجموعی آبادی کا تصور کریں تو میرے خیال میں اکثریت نان بلیورز کی ہے جو خدا، آخرت اور آسمانی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے۔ آج یہ فکر عام ہے کہ ہم انسان صاحبِ عقل، صاحبِ فہم اور صاحبِ دانش ہیں، ہم اپنی زندگی اور اپنے معاملات

کے فیصلے کرنے میں خود مختار ہیں۔

تاریخی پس منظر

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیثِ مبارکہ میں بنی اسرائیل کے حوالے سے ان کے سیاسی نظام کی تشریح فرمائی ہے۔ کیونکہ ہم سے پہلے اس روئے زمین پر مذہبی سیادت و قیادت اور سوسائٹی کی رہنمائی بنی اسرائیل کر رہے تھے۔ حضرت یعقوبؑ بلکہ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک زیادہ انبیاء اور شریعتیں، صحیفے اور کتابیں بنی اسرائیل میں ہی آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا انی فضلتکم علی العالمین (البقرہ ۴۷) کہ میں نے اپنے زمانے میں بنی اسرائیل کو دنیا کے تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ چنانچہ جناب نبی کریمؐ بنی اسرائیل کا سیاسی نظام بیان فرماتے ہیں، قرآن مجید میں بھی اس کی بعض باتوں کا ذکر ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرامؑ کیا کرتے تھے۔ حکومت کرنا، حکومت قائم کرنا، حکومتوں کی رہنمائی کرنا، حکومتوں کو کنٹرول کرنا، یہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کا کام تھا۔ فرمایا کہ کلما ھلک نبی خلفہ نبی ایک نبی جاتا تو دوسرا آجاتا۔

بنی اسرائیل نے اپنی حکومت کا آغاز مصر سے کیا تھا اور پہلے حکمران حضرت یوسفؑ ہیں۔ پھر جب بنی اسرائیل مصر میں غلام بن گئے اور فرعون کے تحت ان کی کئی نسلیں غلامی کی گزریں تو اس کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی کا مشن لے کر بھی اللہ کے پیغمبر ہی آئے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو اللہ رب العزت نے نبوت دی اور ان کے مشن میں ان کی درخواست پر ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو شامل کیا تو اللہ رب العزت نے ان دونوں بھائیوں کو فرعون کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ان ارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم (طٰہٰ ۴۷) تم نے بنی اسرائیل کو جو غلامی کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے اس سے نجات دو۔ ہم ان کو اور اپنے خاندان کو لے کر فلسطین واپس لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے ہمارے ابا جان حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام آئے تھے، اس لیے ہمارا راستہ مت روکو اور ہمیں اپنے وطن واپس جانے دو۔ گویا فرعون کے پاس حضرت موسیٰؑ کے جانے کا مقصد بنی اسرائیل کی آزادی تھی، اور یہ سیاسی مقصد تھا۔ غلامی سے آزادی اور قوم کی آزادی۔

اس کو یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ قوموں کی آزادی کی جنگ لڑنا بھی پیغمبروں کا کام ہے اور یہ بھی دین

کے تقاضوں اور انبیاءؑ کے فرائض میں سے ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اس کے لیے باقاعدہ فرعون سے مطالبہ کیا تو اس پر فرعون نے ان دونوں بھائیوں کے حوالے سے جو طعنہ دیا وہ یہ تھا کہ یہ ہمیں ہماری حکومت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ فرعون نے یہ طعنہ بھی دیا الم نربک فینا ولیدا ولبثت فینا من عمرک سنین (الشعراء ۱۸) تجھے یاد ہے جب تم میرے گھر میں پلے تھے، میری روٹیوں پر پل کر اب میرے سامنے کھڑے ہو، تم نے عمر کا ایک بڑا حصہ ہمارے پاس گزارا ہے۔ فرعون نے یہ بھی کہا وفعلت فعلتک التی فعلت (الشعراء ۱۹) تمہیں یاد ہے جب تم ایک آدمی کو قتل کر کے بھاگ گئے تھے۔ اس کا حضرت موسیٰؑ نے بڑا دلچسپ کمال کا جواب دیا فرمایا تلک نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل (الشعراء ۲۲) کیا تم مجھ پر یہ احسان جتاتے ہو کہ تم نے میری قوم کو صدیوں سے غلام بنا رکھا ہے۔ چار روٹیاں کھلا کر دو دن گھر میں رکھ کر یہ احسان جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

میں یہ سارا پس منظر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح میں ذکر کر رہا ہوں کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت موسیٰؑ سیاسی مشن لے کر آئے تھے، بنی اسرائیل کی آزادی کا پروگرام لے کر آئے تھے۔

باقی مراحل کی باتیں چھوڑتے ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ نے کیسے فرعون کا مقابلہ کیا، پھر قوم کو کیسے لے کر نکلے، اللہ تعالیٰ نے کیسے نجات دی، اس سے اگلا مرحلہ دیکھیں کہ جب بنی اسرائیل وادی تیہ میں گئے تو انہیں حکم ہوا کہ اپنا وطن فلسطین آزاد کراؤ۔ بحیرۂ قلزم عبور کرنے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کا مشن فرعون کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا تھا، جبکہ وادی تیہ میں مشن یہ تھا کہ اپنے ملک پر قبضہ کرو۔ یا قوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم (المائدہ ۲۱) جاؤ بیت المقدس جا کر جہاد کرو۔ لیکن بنی اسرائیل میں ہمت نہیں تھی، انہوں نے کہا ان فیها قوما جبارین وانا لن ندخلها حتی یخرجوا منها (المائدہ ۲۲) کہ ہم نہیں جا سکتے جب تک دشمن وہاں سے نکل نہیں جاتا۔ ان کا آخری جواب یہ تھا کہ آپ اور آپ کا رب جا کر لڑے، ہم سے تو نہیں لڑا جاتا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے حسرت کا اظہار فرمایا رب انی لا املک الا نفسی واخی (المائدہ ۲۵) کہ یا اللہ میں تو اپنا مالک ہوں اور زیادہ سے زیادہ اپنے بھائی کو زور دے سکتا ہوں، اور تو کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتا فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین (المائدہ ۲۵)

یہ سارا مکالمہ اس پس منظر میں ہے کہ اللہ رب العزت بنی اسرائیل کو حکم دے رہے ہیں کہ جا کر جنگ لڑو، اپنے وطن کو آزاد کراؤ اور وطن کا قبضہ حاصل کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے انکار کیا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے، ہم نہیں جائیں گے۔ لہٰذا انہیں اس انکار کی سزا ملی انها محرمة عليهم اربعين سنة (المائدہ ٢٦) وہ سزا یہ تھی کہ تم چالیس سال کیمپوں میں ہی رہو گے، صحرا میں بھٹکتے پھرو گے، زمین میں بھٹکتے پھرو گے، کبھی یہاں کیمپ لگا لیا اور کبھی وہاں، جیسے ہمارے ہاں خانہ بدوش ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی یہی حالت رہی۔

ادھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فوت ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ کی حسرت دیکھیے کہ فوت ہو رہے ہیں اور وطن آزاد نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں کہ یا اللہ! میں زندگی میں بیت المقدس نہیں جا سکا، کم از کم میری قبر کو بیت المقدس کے قریب کر دے۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ رب العزت نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو بیت المقدس کے اتنے فاصلے پر جا کر دفن کرو جتنی دور سے ایک پتھر کو پھینکا جا سکتا ہے۔ پھر ان کے بعد حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں جنگ لڑی گئی، بیت المقدس فتح ہوا اور حکومت قائم ہوئی۔ یہ تیسرا دور تھا حضرت یوسفؑ کے بعد۔

پھر ایک اور مرحلے پر غور کر لیں۔ ایک وقت پھر آیا جب بیت المقدس پر ظالم قوتوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ انسانی سوسائٹی کی ترتیب ہے کہ ایک قوم آتی ہے، اچھے اعمال کے ساتھ اپنا مقام بناتی ہے، اس کی تین چار نسلیں چلتی ہیں، پھر جب ان میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ کمزور ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں تو پھر کوئی دوسری قوم آ جاتی ہے، پھر ان کے بعد تیسری قوم آ جاتی ہے۔ انسانی سوسائٹی کا نظام اسی طرح چل رہا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل پر پھر ایک وقت آیا جب وہ غلام ہو گئے۔ فلسطین پر جالوت کا قبضہ ہو گیا، یہ ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ اس کے خلاف پھر آزادی کی جنگ کا مرحلہ درپیش تھا۔ یہ مرحلہ کیسے طے ہوا؟

قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے کہ اس وقت حضرت سموئیلؑ پیغمبر تھے۔ بنی اسرائیل اکٹھے ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی ابعث لنا ملكا نقاتل فى سبيل الله (البقرہ ٢٤٦) کہ کسی کو ہمارا امیر بنا دیجیے تاکہ ہم اس کی قیادت میں جہاد کر سکیں۔ حضرت سموئیلؑ نے حضرت طالوتؓ کو ان پر امیر مقرر کیا۔ لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا کہ آپ نے کیسا بادشاہ بنا دیا ولم يؤت سعة من المال (البقرہ ٢٤٧) کہ اس کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں، یہ تو معاشی طور پر بہت کمزور آدمی ہے۔ حضرت

سموئیلؑ نے فرمایا ان اللہ اصطفہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم (البقرہ ۲۴۷) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب کیا ہے، یہ جسمانی طور پر بھی ٹھیک ہیں اور علم کے لحاظ سے بھی ٹھیک ہیں، ان میں قیادت کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت طالوتؒ کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جنگ لڑی۔ لیکن پیچھے اصل قائد جنہوں نے سارا نظم قائم کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سموئیلؑ ہیں جن سے درخواست کر کے بادشاہ مقرر کروایا تھا۔ میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت انبیاء کر رہے تھے۔ اس جنگ کا نقشہ بھی قرآن مجید نے بڑا عجیب بیان فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے کسی بات میں ابہام نہیں چھوڑا۔ اگر ہم قرآن مجید کو ذوق کے ساتھ پڑھیں تو ہمیں معلوم ہو گا۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت طالوتؒ چلے، اسی ہزار کی تعداد میں لشکر ان کی قیادت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آزماتا ہوں کہ کون لڑنے کے قابل ہے اور کون نہیں ہے۔ فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ مبتلیکم بنھر (البقرہ ۲۴۹) نہر سے مراد دریائے اردن ہے۔ اِس وقت فلسطین اور اردن کے درمیان جو سرحد ہے، یہ دریائے اردن کا مغربی اور مشرقی کنارہ ہے جو آج بھی میدانِ جنگ ہے۔ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان محاذ جنگ بھی یہی دریائے اردن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آزمانے کے لیے نہر میں آزمائش رکھ دی کہ جو نہر میں سے پانی پی لے گا وہ جہاد نہیں کر سکے گا۔ جب لشکر نے نہر پار کی تو تین سو تیرہ رہ گئے جنہوں نے جالوت کا مقابلہ کیا اور جنگ جیتی۔

جالوت کو کس نے قتل کیا؟ حضرت طالوت کے لشکر حضرت داود علیہ السلام ایک نوجوان مجاہد کے طور پر شریک تھے، ان کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا، کافروں کو شکست ہوئی، اور پھر اللہ رب العزت نے حضرت داؤدؑ کو بادشاہت دے دی۔ وہ ایسے کہ حضرت طالوتؒ نے خوشی میں حضرت داؤدؑ کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا تھا اور اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ حضرت طالوتؒ کی وفات پر حضرت داؤدؑ ان کے جانشین بنے، پھر اللہ رب العزت نے حضرت داؤدؑ کو خلافت عطا فرمائی۔ چنانچہ یہ خلافت کی بنیاد ہے۔

اللہ رب العزت نے حضرت داؤدؑ سے فرمایا یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض (ص ۲۶) ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنا دیا ہے۔ اس کے بعد دو اصول بیان فرمائے فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ (ص ۲۶) کہ آپ نے حق کے ساتھ حکومت کرنی ہے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی۔ وہی اصول جو شروع سے چلا آ رہا تھا کہ انسانی سوسائٹی کے لیے پیروی کی بنیاد آسمانی تعلیمات ہیں یا انسانی خواہشات ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ حکمران بنے اور ریاست قائم

ہوئی جس کا نام اسرائیل تھا۔

حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ بادشاہ ہوئے اور ان کی بادشاہت تو ایسی تھی کہ قرآن مجید میں ان کی دعا کا ذکر ہے رب اغفرلی و هب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی (ص ۳۵) یا اللہ مجھے ایسی حکومت دے جیسی میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ چنانچہ پھر ایسی حکومت کسی کو نہیں ملی۔ آپ علیہ السلام کی انسانوں کے علاوہ جنّوں پر، ہوا، سمندر، پرندوں، جانوروں سب پر حکومت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلطنت کو اتنی وسعت عطا فرمائی کہ یہودی آج تک اس اسرائیل کو نہیں بھول رہے۔

میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے اسرائیل کی بنیاد اسی اسرائیل پر ہے۔ یہودیوں نے وہ ریاست دوبارہ بحال کرنے کے لیے اسرائیل کے نام سے فلسطین کے ایک حصے پر قبضہ کر کے ریاست بنائی ہے اور ان کا اصل ہدف گریٹر اسرائیل کے عنوان سے وہی عظیم تر اسرائیل ہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ تصور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں اسرائیل کا جو جغرافیہ اور حدود تھیں ہم نے ان حدود تک پہنچنا ہے۔ وہ اسے اپنا فریضہ اور اپنا قومی حق سمجھتے ہیں۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ نیٹ پر موجود ہے۔ اس میں مدینہ منورہ، خیبر، مصر، عراق، اردن، شام اور آدھا سوڈان شامل ہے۔ گریٹر اسرائیل کی حد مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے۔ یہود کا کہنا ہے کہ مدینہ تم نے ہم سے چھینا تھا، خیبر سے بھی ہمیں جبری نکالا تھا، اس لیے مدینہ بھی ہمارا ہے اور خیبر بھی ہمارا ہے۔ ہم نے حضرت سلیمانؑ کے دور کی ریاست دوبارہ بحال کرنی ہے اور وہاں تک جانا ہے جہاں تک ان کی حکومت تھی۔ چنانچہ اس وقت وہ گریٹر اسرائیل کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔

میں خلافت کے حوالے سے یہ بات کر رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کرتے تھے۔ میں نے اس سیاسی قیادت کی کچھ جھلکیاں عرض کی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے حوالے سے، فرعون کے خلاف آزادی کی جنگ کے حوالے سے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں جہاد، پھر حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں فلسطین پر دوبارہ قبضہ، پھر حضرت طالوتؒ، حضرت سموئیلؑ اور حضرت داؤدؑ کا جہاد، اور پھر اسرائیل کا قیام۔ یہ سارا تسلسل میں نے بیان کیا ہے جو حضرت یوسفؑ سے شروع ہوا اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں جب رومیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا، اس وقت تک بنی اسرائیل کی حکومت کا تسلسل قائم رہا۔

انبیاء کرامؑ کے بعد خلفاء کی ذمہ داری

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سیاسی فلسفے کی وضاحت فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل میں انبیاءؑ سیاسی قیادت کیا کرتے تھے کلما ھلک نبی خلفہ نبی ایک نبی فوت ہوجاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ وانہ لا نبی بعدی میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ نظام کیسے چلے گا۔ پہلے تو اس نظام کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آتے رہتے تھے، اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا تو یہ نظام کیسے چلے گا۔ اس لیے حضورؐ نے ساتھ ہی فرمادیا وسیکون بعدی خلفاء کہ میرے بعد اس سیاسی نظام کو چلانے کے لیے خلفاء ہوں گے جو مسلمانوں کے سیاسی نظام کی قیادت کریں گے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق آپؐ کے بعد خلیفۃ رسول اللہ حضرت صدیق اکبرؓ نے خلافت کا منصب سنبھالا۔ اور حضورؐ کے بعد آپؐ کی نیابت میں امت کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی نظام کو چلانا، اسی کا نام خلافت ہے۔ ہم مسلمانوں کا جو شرعی سیاسی نظام ہے اس کی اصطلاح ”خلافت“ ہے۔

نیابت اللہ کی، یا رسول اللہ کی؟

یہاں ایک بنیادی بات توجہ طلب ہے جس پر مجھے اور آپ کو غور کرنا چاہیے۔ عام طور پر جب خلافت کی بات ہوتی ہے تو ہم خلیفہ کو اللہ کا خلیفہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات دو حوالوں سے درست نہیں ہے۔ الاحکام السلطانیہ میں قاضی ابویعلیٰ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت صدیق اکبرؓ کو کہہ دیا یا خلیفۃ اللہ! تو آپؓ نے ٹوک دیا لست بخلیفۃ اللہ، انا خلیفۃ رسول اللہ کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں، میں رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سرکاری لقب اور سرکاری منصب کا ٹائٹل خلیفۃ رسول اللہ تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں امیر المؤمنین کی اصطلاح نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ اصطلاح نہیں تھی۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو ان کا خطاب یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ ہوگیا۔ حضرت عمرؓ کو الجھن ہوتی تھی کہ تیسرے خلیفہ کو کہا جائے گا یا خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ اور چوتھا کہلائے گا یا خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ یہ تو لمبا قصہ ہوجائے گا۔ حضرت عمرؓ کو دو کلموں والے تکرار پر ہی الجھن ہوتی تھی۔ ایک دن حضرت عمرو بن العاصؓ آئے اور بے ساختہ حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا یا امیر المومنین! حضرت عمرؓ چونکے اور پوچھا تم نے کیا کہا۔ انہوں نے سوچا شاید مجھ سے گڑبڑ ہوگئی ہے کہ میں نے نئی

بات کہہ دی ہے۔ حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان اور مومن ہیں، آپ ہمارے امیر ہیں، اس لیے میں نے آپ کو امیر المومنین کہا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ بہت اچھی بات ہے، بس آج کے بعد مجھے یہی کہا کرو۔ چنانچہ اس کے بعد سے آج تک مسلمان حکمران کے لیے امیر المؤمنین کا لقب چلا آرہا ہے۔

درمیان میں ایک لطیفہ ذکر کرنا چاہوں گا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو چونکہ آپؓ خلیفہ راشد اور مجتہد تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے دور میں بہت سے معاملات میں تبدیلیاں کیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ خلفاء نے اپنے اپنے دور میں پچھلے نظام میں کیا کیا تبدیلیاں کیں جو نافذ ہوئیں اور آج تک نافذ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے نظام میں حضرت عمرؓ نے کیا تبدیلیاں کیں؟ حضرت عمرؓ کے نظام میں حضرت عثمانؓ نے کیا تبدیلیاں کیں؟ اور حضرت عثمانؓ کے نظام میں حضرت علیؓ نے کیا تبدیلیاں کیں؟ یہ مستقل موضوع ہے لیکن میں صرف ایک جزوی بات کرنا چاہتا ہوں کہ منبر رسولؐ کی تین سیڑھیاں تھیں اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جمعہ کا خطبہ اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر دیا کرتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ آئے تو احتراماً دوسری سیڑھی پر آگئے۔ حضرت عمرؓ آئے تو احتراماً تیسری سیڑھی پر آگئے۔ حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو سیڑھیاں چونکہ تین ہی تھیں، تو حضرت عثمانؓ نے پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا، جہاں حضورؐ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ پر سب سے پہلا اعتراض یہ ہوا کہ انہوں نے پہلے والی روایت قائم نے نہیں رکھی، انہیں نیچے کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا کہ دیکھو میرے پہلے بزرگوں نے ادب و احترام کا تقاضہ ملحوظ رکھا ہے، ان کا عمل بھی ٹھیک تھا، لیکن میں نے اصل سنت پر عمل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا ہے۔

جو لطیفہ ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عباسیوں اور امویوں کے درمیان سیاسی چپقلش تھی، کیونکہ عباسیوں نے امویوں سے حکومت چھینی تھی۔ ایک دفعہ عباسی خلیفہ غالباً منصور کے دربار میں حضرت عثمانؓ کے بارے میں ذکر ہو رہا تھا، وہ بنواُمیہ میں سے تھے جن سے اس کی سیاسی مخاصمت تھی، تو اس نے اپنے درباریوں سے سوال کیا کہ حضرت عثمان پر پہلا اعتراض کیا ہوا تھا؟ سیاسی مخاصمت میں فطری بات ہے، ایسا ہوتا ہے۔ مجلس میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، ان کو حضرت عثمانؓ کا اس انداز سے تذکرہ پسند نہ آیا۔ ان بزرگ نے کہا کہ حضرت عثمانؓ پر پہلا اعتراض یہی ہوا تھا کہ وہ منبر کی اوپر کی

سیڑھی پر کیوں جا کھڑے ہوئے تھے، اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ وہ پہلے بزرگوں کی روایت پر قائم نہیں رہے۔ لیکن امیر المومنین حضرت عثمانؓ پر جو اعتراض بھی ہوا ہو، امیر المؤمنین! ان کا آپ پر بہت بڑا احسان ہے۔ منصور نے کہا، حضرت عثمانؓ کا مجھ پر کیا احسان ہے؟ ان بزرگ نے کہا کہ اگر حضرت عثمانؓ پچھلی روایت کو قائم کرتے ہوئے زمین پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، تو ان کے بعد آنے والا خلیفہ زمین کھود کر اندر کھڑا ہو کر خطبہ دیتا، اور اس کے بعد آنے والا اس سے زیادہ نیچے تک زمین کھود کر وہاں کھڑا ہوتا، اور اگر وہ روایت یوں ہی چلتی رہتی تو آپ کا وقت آنے تک آپ کنویں کے اندر سے خطبہ دیتے اور ہم اوپر کھڑے ہو کر سنتے کہ امیر المومنین خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے پہلی روایت قائم نہ رکھ کر آپ پر بڑا احسان کیا ہے۔

اگر فقہاء کی تصریحات کو دیکھا جائے کہ وہ خلافت کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ امت کے اجتماعی معاملات کو کنٹرول کرنا، عدل قائم کرنا، انصاف فراہم کرنا، لوگوں کی ضروریات پوری کرنا، جہاد کی قیادت کرنا، بیت المال کا نظام قائم کرنا، یعنی حکومت کے سبھی کام سرانجام دینا۔ آپ جہاں بھی خلافت کی تعریف پڑھیں گے اس میں کوئی فقیہ نیابۃ عن اللہ نہیں کہتا، بلکہ نیابۃ عن النبی ﷺ کے الفاظ ملیں گے، کیونکہ خلیفہ نائب ہوتا ہے نبی کا۔ اہل سنت کے ہاں یہی ہے، اس پر ایک بہت بڑے فرق کی بنیاد ہے جو میں عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔

خلافت اور امامت

سیاسی نظام پر اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا بنیادی اختلاف ہے۔ اہلِ تشیع امامت کی اصطلاح کے ساتھ بات کرتے ہیں اور اہلِ سنت خلافت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ امامت اور خلافت، یا امام اور خلیفہ میں کیا فرق ہے؟

خلافت اور امامت کا بنیادی فرق

1. اہلِ تشیع امام کو خدا کا نمائندہ اور معصوم عن الخطا کہتے ہیں، اور پیغمبر کی طرح اتھارٹی اور اختلاف سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ امامت میں اللہ کی نیابت ہے، جبکہ خلافت میں اللہ کے رسول کی نیابت ہے۔ جب ایک آدمی کے بارے میں ہم یہ تصور کرلیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تو اس کی کسی بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی۔ جب اس کو اللہ کا نمائندہ کسی حیثیت سے مان لیا تو پھر وہ معصوم ہے، اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ امامت اور خلافت میں ایک فرق تو یہی بنیادی تصور ہے کہ امام اللہ کا نمائندہ ہے، جبکہ خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کے رسول کا نمائندہ ہے۔
2. امام نامزد اور وصی ہے، جبکہ خلیفہ وصی نہیں ہے بلکہ امت کی اجتماعی صوابدید پر منتخب ہوتا ہے۔ اہلِ تشیع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وصی رسول اللہ کہتے ہیں، جس کا معنٰی ہے کہ حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد جانشین ہیں۔ جبکہ اہل سنت کے ہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ تمام تر فضائل و مناقب، بزرگی و برتری کے باوجود وصی اور نامزد نہیں ہیں بلکہ امت کی اجتماعی رائے سے خلیفہ منتخب ہوئے۔ حضور نبی کریمؐ نے آپ کے متعلق کئی اشارات کیے، ان کو اپنی جگہ مصلٰی پر کھڑا کیا، اشارات اور کنایات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، حتٰی کہ جناب نبی کریمؐ نے بیماری کے ایام میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا اپنے ابا جان اور بھائی کو بلاؤ میں لکھ دیتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ میرے بعد کئی امیدوار کھڑے ہو جائیں یتمنی المتمنون

لیکن پھر انکار فرما دیا کہ یابی اللہ والمومنون الا ابابکر اللہ بھی ابوبکر کے علاوہ کسی اور کو نہیں بنائے گا اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ امت پر اعتماد تھا کہ امت صحیح فیصلہ کرے گی۔ چنانچہ جناب نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد نہیں کیا، بلکہ آپ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں بحث مباحثہ کے بعد اجتماعی رائے سے ہوا۔ پہلے اختلاف رائے ہوا پھر بالآخر اتفاق رائے پیدا ہوا اور حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔

3. امام اور خلیفہ میں تیسرا فرق یہ ہے کہ امام معصوم عن الخطا ہے، جبکہ خلیفہ مجتہد ہے یخطئ و یصیب خلیفہ کا شرعی مقام مجتہد کا ہے، وہ معصوم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہم جس امام کی تقلید کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی یہ کہتے ہیں مصیب یحتمل الخطا۔ اور جس امام کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں اس کے بارے میں کہتے ہیں مخطئ یحتمل الصواب۔ اجتہاد کا دائرہ یہی ہے۔ خلیفہ کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے، جبکہ امام کی رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ امام کے معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فائنل اتھارٹی ہے، اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کسی بات پر اعتراض نہیں ہو سکتا، اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ خلیفہ معصوم نہیں بلکہ مجتہد ہے۔ اس لیے خلیفہ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس کے فیصلے تبدیل ہو سکتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں یہ اصول بیان فرمایا کہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے مطابق چلوں گا۔ اگر میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر آپ کو محسوس ہو کہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق نہیں چل رہا تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ اس لیے اہلِ سنت کے ہاں خلیفہ کی اطاعت قرآن و سنت کے دائرے کی پابند ہے۔ قرآن و سنت سے ہٹ کر بات ہوگی تو حضرت صدیق اکبرؓ فرما رہے ہیں کہ تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔ جبکہ اہلِ تشیع کے ہاں امام چونکہ معصوم ہے، تو اس کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے۔ خلیفہ اور امام کا یہی فرق ہے کہ رعیت کو خلیفہ کی رائے سے اختلاف کا حق حاصل ہے، خلیفہ کا احتساب کرنے اور خلیفہ کے فیصلے پر احتجاج کا حق حاصل ہے۔ لیکن امام کی کسی بات سے نہ اختلاف کیا جا سکتا ہے، نہ اس کا احتساب کیا جا سکتا ہے، نہ امام کے خلاف

کسی کو رائے دینے کا حق ہے۔ اس لیے کہ بنیادی فرق یہ ہے کہ خلیفہ نے اپنے لیے قرآن و سنت کی پابندی قبول کی ہے، جبکہ امام اللہ کا نمائندہ اور مامور من اللہ سمجھا جاتا ہے۔

4. امام اور خلیفہ میں چوتھا فرق یہ ہے کہ امام خاندانی ہوتا ہے۔ ایک ہی خاندان میں بارہ امام آئے، سب خاندانی اور نسبی ہیں۔ جبکہ خلفائے راشدین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔ ہمارا آئیڈیل اور معیار خلافت راشدہ ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، چند مہینے کے لیے حضرت حسن، پھر حضرت معاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان ساتوں بزرگوں میں سے سوائے اس کے کہ حضرت حسنؓ حضرت علیؓ کے بیٹے ہیں جو امیر المومنین بنے اور چھ مہینہ خلیفہ رہے، ان کے علاوہ باقی چھ میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کا نسبی جانشین نہیں ہے۔ اس لیے خلافت نسبی اور خاندانی نہیں، جبکہ امامت نسبی ہے۔

اہلِ تشیع کے ہاں امامت کا تصور

میں نے اس نکتے پر توجہ دلائی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے حوالے سے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے ہاں خلافت اور امامت دو متوازی نظریے ہیں۔ اہلِ تشیع میں جتنے بھی گروہ ہیں وہ امامت کے حوالے سے سیاسی نظام کی بات کرتے ہیں۔ پھر آگے تقسیم ہے کوئی امام حاضر کی بات کرتا ہے تو کوئی امام غائب کی بات کرتا ہے، لیکن ان کا تصور، جس کی بنیاد وصیت پر ہے، امامت کے عنوان سے ہے۔ اس لیے حضرت علیؓ کے بارے میں ان کا کہنا ہے وصی رسول اللہ کہ آپ حضور نبی کریمؐ کے نامزد کردہ جانشین تھے۔ پھر وہی جانشین آگے چلتے گئے۔ اثنا عشریہ شیعہ کے ہاں اماموں کا سلسلہ بارہ پر جا کر رک گیا۔ بارہویں امام غارِ سر من رای میں منظر عام سے غائب ہو گئے۔ اسماعیلیہ اور زیدیہ بھی شیعہ کے فرقے ہیں لیکن ان کے ہاں امام غائب نہیں ہیں بلکہ اب تک چلے آ رہے ہیں۔ موجودہ اسماعیلی امام پرنس کریم آغا خان اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔ ان کا ایک فرقہ بوہرہ ہے جن کے امام ابھی فوت ہوئے ہیں جو چھیالیسویں یا سینتالیسویں امام تھے۔ اسی طرح زیدیہ بھی امام حاضر کے قائل ہیں۔ البتہ اثنا عشریہ امام غائب کے قائل ہیں، وہ امام غائب کا خلا کیسے پر کر رہے ہیں، اس پر بعد میں بات کروں گا۔

اہل سنت کے ہاں خلیفہ وصی نہیں ہے، چنانچہ حضور نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نامزد نہیں

کیا بلکہ آپ بحث ومباحثہ کے بعد امت کی اجتماعی مشاورت سے خلیفہ منتخب ہوئے۔ اسے اصحاب الرائے کی مشاورت کہہ لیں یا عوام کی مشاورت، تاہم آپ مشاورت سے خلیفہ منتخب ہوئے۔

خلافت اور پاپائیت

یہ بات ایک اور تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں جو آج کی فکری اور سماجی دنیا کا بہت بڑا مسئلہ اور بہت بڑا مغالطہ ہے۔

پاپائیت کا پس منظر

مغرب کے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں پاپائیت کو مسترد کر دیا تھا۔ جبکہ رومن کیتھولک آج بھی پاپائے روم کے تابع ہیں۔ لیکن ایک زمانہ گزرا ہے جب رومن کیتھولک پاپائے روم حکمرانوں کے سرپرست ہوتے تھے، ان کا فیصلہ آخری ہوتا تھا، ان کے فیصلے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا، چرچ کو اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا، اس سے اختلاف ممکن نہیں تھا، کیونکہ پاپائے روم اللہ کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔ عیسائیت میں چرچ اللہ کا نمائندہ ہے، جبکہ ہمارے ہاں مسجد اور خلافت رسول اللہ کے نمائندے ہیں۔ یہ بنیادی فرق ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں مسجد اور خلیفہ کو اپنی بات کے جواز کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دلیل لانی ہوگی، جبکہ پوپ کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، وہ مامور من اللہ تصور ہوتا تھا، اس سے کوئی اختلاف اور اس کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوتی تھی۔

جب چرچ نے سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور فیصلے صادر کرنا شروع کر دیے، تو یہ جو بغیر اپیل اور بغیر اختلاف کے اتھارٹی تھی، اس کے خلاف بغاوت ہوئی اور پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا جس کی بنیاد مارٹن لوتھر نے رکھی۔ مارٹن لوتھر دو ہیں۔ ایک مارٹن لوتھر پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی ہے، اور دوسرا مارٹن لوتھر کنگ وہ ہے جو امریکہ میں سیاہ فاموں کی تحریک کا لیڈر تھا۔ دونوں پادری تھے۔ میں مارٹن لوتھر اول کی بات کر رہا ہوں جس نے پاپائے روم کی اس اتھارٹی کو چیلنج کیا اور بغاوت کی کہ ہم پاپائے روم اور چرچ کی اتھارٹی نہیں مانتے کہ وہ بائبل کی تشریح میں جو کہہ دے وہ حرفِ آخر ہے اور ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنیاد پر بغاوت ہوئی تھی اور چرچ کی

بالادستی مسترد کر دی گئی تھی۔ اس کو تھیاکریسی کا نام دیا گیا۔ آج بھی جب آپ خلافت کی بات کریں گے تو بہت سے جدت پسند لوگ آپ کو طعنہ دیں گے کہ آپ تھیاکریسی، مذہبی اجارہ داری، اور پاپائیت کی بات کر رہے ہیں، اور آپ وہی اختیارات واپس لانا چاہ رہے ہیں۔

مغرب کی مذہب بیزاری کا سبب

میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کی مغربی دنیا مذہب سے متنفر کیوں ہے؟ اس کا سبب جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مغرب میں جب اجتماعیات، ریاست، حکومت اور قانون کے معاملات میں مذہب کی بات آتی ہے تو مغربی دنیا اتنی سخت مخالفت کیوں کرتی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب، چرچ اور پاپائے روم نے پاپائیت کی اتھارٹی کے ساتھ صدیوں مغرب پر مظالم ڈھائے ہیں۔ آکسفورڈ ان کا مذہبی اور ثقافتی مرکز تھا، اور یہ سب اس کے مذہبی مدرسے تھے جو بغاوت کے بعد کالج اور یونیورسٹی میں تبدیل ہو گئے۔ آکسفورڈ ان کا جامعہ ازہر سمجھ لیں۔ میں نے آکسفورڈ میں وہ مقامات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جہاں پادری صاحب بیٹھتے تھے، کسی بھی آدمی کو پیش کیا جاتا کہ اس نے فلاں بات کی ہے، سرسری سی سماعت کے بعد پادری صاحب حکم دیتے کہ یہ مرتد ہو گیا ہے، اس کو اسی وقت پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ میں نے وہ مقامات دیکھے ہیں جہاں مذہبی عدالت لگتی تھی، پادری کا اختیار چلتا تھا، سرسری سماعت کے بعد ملزم کو درخت کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا۔ صدیوں تک مسیحی مذہب، پاپائیت، چرچ اور تھیاکریسی نے مغربی دنیا پر مظالم ڈھائے، بے شمار لوگ قتل کیے۔ اس لیے آج جب مغرب کے کسی آدمی سے آپ مذہبی حکومت کی بات کریں گے تو اس کے ذہن میں وہ تصور آجاتا ہے، اس لیے مغربی دنیا مذہب کے نام سے متنفر ہے۔

مگر ہمارا نظام پاپائیت نہیں ہے بلکہ شورائیت ہے۔ فقہاء نے خلیفہ کی جو شرائط لکھی ہیں ان میں خلیفہ کا مجتہد ہونا بھی ہے۔ یعنی باقی شرائط کے ساتھ جو مجتہد درجے کا عالم ہو گا وہ خلیفہ بنے گا۔ اور مجتہد کا معنٰی یہ ہے کہ وہ حرفِ آخر نہیں ہے، اس کی بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں مغرب والوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ہمیں غلط طور پر پاپائیت کی طرف منسوب کرتے ہو۔ پاپائیت اگر کسی طور پر ہے تو امام معصوم میں تو اس کا مفہوم پایا جاتا ہے لیکن خلیفہ مجتہد میں پاپائیت کا تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ فرق ہمیں سمجھنا چاہیے۔ وہ فائنل اتھارٹی جس کے خلاف اپیل نہیں ہو سکتی اس کو تو آپ پاپائیت کہہ سکتے ہیں، لیکن جس کی بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، جس کا فیصلہ دلیل کی بنیاد پر تبدیل

کیا جاسکتا ہے، جس کا احتساب کیا جاسکتا ہے، اس کو پاپائیت کہنا ناواقفیت کی دلیل ہے، یا ضد کی علامت ہے۔

خلافت، دلیل کی حکومت

آج کے جمہوری تناظر کے حوالے سے یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کہا جاتا ہے کہ ہم نے دلیل و قانون کی حکومت قائم کی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بادشاہت اور جمہوریت دونوں میں حکومت دلیل و قانون کی نہیں ہے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت جو فیصلہ کردے، اس پر کوئی دلیل ہے یا نہیں، تاہم وہ قانون ہے۔ اور جس دستور کی پارلیمنٹ پابند ہے، اسی دستور میں ترمیم کا مجاز خود وہی پارلیمنٹ، ہے تو یہ کیسی دلیل کی حکومت ہے؟ مثلاً میں جس قانون کی پابندی قبول کرتا ہوں، اگر اسی قانون میں تبدیلی کا اختیار بھی مجھے ہی ہے، تو میں کون سی پابندی قبول کر رہا ہوں؟ اس لیے یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ جمہوریت اور بادشاہت دلیل کی حکومت ہوتی ہے۔ صرف ایک خلیفہ ہے جو قانون کا پابند ہے، اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ آپ کا فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ لیکن خلیفہ کو قرآن و سنت کے قوانین میں تبدیلی اور ترمیم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ دلیل کی حکومت اسے کہتے ہیں۔

چنانچہ پاپائیت والوں سے یہ مکالمہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں پاپائیت نہیں بلکہ شورائیت اور دلیل و قانون ہے۔ جبکہ جمہوریت والوں سے ہمارا مکالمہ یہ ہے کہ تم قانون کی حکومت کی بات کرتے ہو لیکن قانون میں ردوبدل کا اختیار بھی اپنے پاس رکھتے ہو، جس اتھارٹی نے پابندی کرنی ہے، ردوبدل بھی اسی نے کرنا ہے تو یہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ لہٰذا پوری دنیا کی تاریخ میں اگر دلیل کی حکومت کہیں ہے تو وہ خلافت میں ہے کہ خلیفہ دلیل کا پابند ہے، اور دلیل میں ردوبدل کا اختیار اسے حاصل نہیں ہے۔ خلیفہ کو نہ قرآن مجید میں ردوبدل کا اختیار ہے اور نہ سنت میں ردوبدل کا اختیار ہے، اسے دلیل کی حکومت کہتے ہیں۔

اینڈ آف دی ہسٹری کون؟

مغرب نے ایک نیا نظریہ متعارف کروایا ہے، وہ اینڈ آف دی ہسٹری (End of the history) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ مکمل ہو چکی ہے، اب اس میں اور کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخ تہذیب و تمدن میں اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے اب اس

کے بعد کوئی تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ اس کے بعد خاتمہ ہی ہے۔ مغربی دانشور آج کل اس معنی میں لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ ہم دنیا کا دورِ عروج ہیں اور ہم آخری زمانہ ہیں، ہمارے بعد کسی اور کا دور نہیں آئے گا۔

میں اس پر کہا کرتا ہوں کہ یہ غلط بات ہے، ابھی ایک اننگز باقی ہے جو ہم نے کھیلنی ہے اور ان شاءاللہ ٹھیک ٹھاک کھیلیں گے۔ ہماری باری آنے والی ہے، لیکن اتنی جلدی بھی نہیں جتنی کچھ حضرات نے سمجھ لی ہے، اور اتنی دور بھی نہیں جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ میں مغرب سے ان کی زبان بولا کرتا ہوں کہ فاؤل نہیں کھیلو۔ فاؤل کا مطلب یہ ہے کہ جس ٹیم کو ہار کا خدشہ ہوتا ہے وہ اپنی باری میں کھیل ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں مغرب سے کہتا ہوں کہ فاؤل نہیں کھیلو اور حوصلے سے کھیلو۔ ہماری ایک اننگز باقی ہے جو ہم نے کھیلنی ہے، اس کے لیے ہم حضرت عیسٰیؑ اور حضرت مہدیؒ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاءاللہ دنیا کو ایک بار پھر وہ منظر دکھائیں گے کہ خلافت کسے کہتے ہیں، عدل وانصاف کیا ہوتا ہے اور حقوق کسے کہتے ہیں؟

میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ ہم نے ایک پیریڈ گزارا ہے اور ٹھیک ٹھاک گزارا ہے۔ خلافت راشدہ سے لے کر خلافتِ عثمانیہ کے عروج تک تقریباً ایک ہزار سال ہم نے آپس کی تمام تر لڑائیوں، جھگڑوں اور تمام تر خرابیوں کے باوجود دنیا پر حکومت اور عالمی قیادت کی ہے۔ اس وقت دنیا کے لیے ہم ہی حکمران تھے۔ ہمارے بعد عالمی قیادت کی طرف برطانیہ بڑھا ہے جو بمشکل (چار) سو سال گزار سکا ہے، پھر رشیا آیا تو وہ بھی پچھتر سال میں ختم ہو گیا۔ اب امریکہ آیا ہے تو پچاس سال میں اس کا بھی سانس پھول گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں، ہماری باری پھر آنے والی ہے، اب جو کیفیت تمہاری ہے ہم نے ایک ہزار سال دنیا پر اسی کیفیت میں حکومت کی ہے۔ ہماری ایک اور باری رہتی ہے لیکن ہمیں ابھی خوش فہم نہیں ہونا چاہیے، ابھی کسی اور کی باری ہے، وہ بھی پچاس، ساٹھ یا ستر سال گزارے گا، اس کے بعد ہماری باری ہوگی ان شاءاللہ، پھر ہم وہی گیم کھیلیں گے جو ہم نے ایک ہزار سال کھیلی ہے۔

اس پر میں ایک روایت بھی پیش کیا کرتا ہوں کہ اینڈ آف دی ہسٹری کون ہے؟ ایک حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیاں جوڑ کر ارشاد فرمایا کہ میں اور قیامت آپس میں یوں ہیں۔ یعنی ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ اینڈ آف دی ہسٹری ہم ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ ہم نے ایک باری بھگتی ہے اور ایک باری ہم نے بھگتنی ہے اس کے بعد قیامت آئے گی۔

خلافت کا سیاسی نظام

امت کا اجتماعی فریضہ

فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ خلیفہ کا انتخاب اور خلافت کا قیام امت کے اجتماعی فرائض میں سے ہے۔ خلافت کے قیام کے فرض ہونے کے دلائل میں دو بڑی دلیلیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بیان فرمائی ہیں:

1. ایک دلیل یہ دی ہے کہ قرآن کریم کے بہت سے احکامات حکومت کی موجودگی پر موقوف ہیں۔ مثلاً حدود کا نفاذ، جہاد، بیت المال کا قیام، عدالتوں کا قیام اور انصاف کی فراہمی وغیرہ، یہ سارے معاملات حکومت کا وجود چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ قرآن مجید کے اوامر اور فرائض ہیں، اور فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے، جیسا کہ وضو ویسے فرض نہیں ہے لیکن چونکہ نماز کی شرط ہے اس لیے وضو کا درجہ بھی فرض کا ہے کہ نماز کی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ قرآن مجید کی سینکڑوں آیات اور بیسیوں احکام کا موقوف علیہ حکومت ہے، اور فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے، اس لیے خلافت کا قیام امت کے ذمے ضروری ہے تاکہ قرآن مجید کے وہ احکام کہ حکومت کے ذریعے جن پر عمل ہو سکتا ہے ان پر عمل کیا جا سکے۔
2. حضرت شاہ ولی اللہؒ خلافت کے قیام کے حوالے سے دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت نے سب سے پہلا کام خلیفہ کے انتخاب اور خلافت کے قیام کا کیا۔ حتیٰ کہ حضور نبی کریمؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی اس کام کو مقدم رکھا۔ بل جعلوہ اہم الواجبات کہ تمام فرائض سے زیادہ بڑا فرض خلافت ہے۔ کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین بعد میں کی لیکن خلیفہ کا انتخاب پہلے کیا۔ لہٰذا امت کے ذمہ فرض ہے کہ بحیثیت امت اس میں خلافت کا نظام موجود ہو۔

پھر فقہاء ایک اور تقسیم کرتے ہیں کہ خلافت کا قیام پوری امت کے ذمے فرض علی الکفایہ ہے۔ اگر دنیا میں کسی جگہ بھی خلیفہ موجود ہے اور خلافت کا نظام قائم ہے تو امت کی طرف سے ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے، لیکن اگر دنیا میں کہیں بھی خلافت کا نظام کسی بھی درجے میں موجود نہیں تو امت بحیثیت امت گنہگار ہے اور فرض کی تارک ہے۔ اس وقت ہم تقریباً اسی پوزیشن میں ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی خلافت قائم نہیں ہے، امارتِ شرعیہ کا وجود اپنی تمام شرائط کے ساتھ نہیں ہے۔ ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تھا جسے سو سال ہو چکے ہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے ۱۹۲۴ء تک کسی نہ کسی سطح پر، کسی نہ کسی انداز میں خلافت کا ٹائٹل اور خلافت کا نظام اور سسٹم موجود رہا، کئی اتار چڑھاؤ آئے، کئی سنوار بگاڑ پیدا ہوئے لیکن خلافت کا نام باقی رہا۔ جب ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کی گئی تو اس کے بعد سے اب تک دنیا میں کہیں بھی خلافت کا نظام عملاً موجود نہیں ہے۔ اس لیے فقہاء کرام کے ارشادات کے مطابق ہم بحیثیت امت ایک شرعی فرض کے تارک ہیں۔

لیکن میں جس نکتے کی وضاحت کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ خلافت کا قیام امت کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اس کے مقابلے میں امامت کا قیام امت کی ذمہ داریوں میں سے نہیں بلکہ امام نامزد ہوتا ہے، امام کو منتخب کرنے میں امت کا کوئی اختیار نہیں ہے، وہ صرف اس کی پابند ہے کہ جو امام وقت ہو اس کی اطاعت کرے اور اس کے احکام کے مطابق چلے۔

انعقادِ خلافت کی صورتیں

ہمارے متکلّمین، ائمہ عقائد اور فقہاء نے خلافت کے قیام اور اس کے انعقاد کی جو صورتیں بیان کی ہیں وہ پانچ ہیں۔

امت کی اجتماعی صوابدید

پہلی صورت یہ کہ امت کی اجتماعی صوابدید پر خلیفہ کا انتخاب ہو۔ جیسے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب امت کی صوابدید پر ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ حضور نبی کریمؐ کی زندگی میں ہی آپ کے جانشین تھے کہ حضور نبی کریمؐ نے حکماً ان کو اپنے مصلے پر کھڑا کیا تھا۔ اور بعض حضرات کی طرف سے معذرت کے باوجود کہ وہ نرم دل ہیں آپ کے مصلے پر کھڑے ہوں گے تو رو پڑیں گے، لیکن حضورؐ نے فرمایا مروا ابابکر فلیصل بالناس کہ ابوبکر ہی میری جگہ نماز پڑھائے گا۔ پھر

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے جانشین اور خلیفہ بنے اور آپ نے تقریباً اڑھائی سال حکومت کی ہے تو اس حکومت کی بنیاد کیا تھی؟

حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کیسے بنی تھی؟ ان کو نہ حضور اکرمؐ نامزد کر کے گئے کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوں گے، اشاروں میں کمی نہیں کی، لیکن نامزد نہیں کیا۔ نہ حضرت صدیق اکبرؓ نے طاقت کے زور پر قبضہ کیا کہ جتھہ لے کر مدینہ پر قبضہ کیا ہو کہ میری خلافت ہے۔ نہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں خلیفہ ہوں میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ اور نہ کوئی نسبی استحقاق تھا کہ بادشاہ کے بیٹے ہیں تو بادشاہ بنیں گے۔

پہلی مشاورت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی، دوسری مشاورت مسجد نبوی میں ہوئی۔ بخاری شریف کی طویل روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انصار مدینہ اکٹھے ہو گئے تھے اور ان کا موقف تھا کہ اکثریت ہماری ہے اس لیے خلیفہ ہم میں سے ہو گا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا اور بنو خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ منتخب بھی کر لیا تھا۔ ابھی بیعت نہیں ہوئی تھی۔ آج کی زبان میں حلف اٹھانا باقی تھا۔ امیدوار کے ووٹ بھی زیادہ تھے۔ کافی طویل بحث مباحثہ ہوا۔ بالآخر سب متفق ہو گئے اور اجتماعی فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے۔ اس پر حضرت علیؓ کو اشکال تھا، اس حوالے سے نہیں کہ مجھے خلیفہ کیوں نہیں بنایا، بلکہ اس حوالے سے اشکال تھا کہ اس مجلس میں ہم نہیں تھے، مشاورت ہمارا بھی حق تھا۔ چنانچہ تین دن بعد مسجد نبوی میں پھر عمومی مجلس ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ کوئی تحفظ ہے تو فرمائیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، ہم نے بھی آپ کو ہی خلیفہ بنانا تھا لیکن ہمیں مشورے میں تو شریک کرتے۔ خاندانِ نبوت مشورے میں نہیں تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کی وضاحت کی کہ آپ کو اس لیے نہیں بلایا کہ ابھی تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین نہیں ہوئی تھی، اگر گھر میں میت ہو تو گھر والوں کو کسی اور کام میں مصروف نہیں کیا جاتا، اس لیے آپ کو نہیں بلایا گیا۔ اس عمومی مجلس میں حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور پھر زندگی بھر حضرت صدیق اکبرؓ پر یہ اعتماد قائم رہا۔ حضرت علیؓ کا تاریخی جملہ ہے کہ جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کا امام بنایا تھا، اسے اپنا مصلیٰ دیا تھا، ہم نے دنیا کے لیے بھی اسی کو امام بنایا۔

حضرت صدیق اکبرؓ امت کی اجتماعی صوابدید پر باہمی اجتماعی مشاورت کے ساتھ خلیفہ مقرر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ امت کی اجتماعی صوابدید کو ابن تیمیہؒ عامۃ المسلمین کی اجتماعی

صوابدید قرار دیتے ہیں کہ عوام فیصلہ کرے گی جیسے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب عوام نے اجتماعی مشاورت سے کیا تھا۔ جبکہ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں اربابِ حل و عقد کی صوابدید پر خلیفہ کا انتخاب ہوگا، یعنی امت کے نمائندے فیصلہ کریں گے۔ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ دونوں سیاسیات کے بڑے امام ہیں۔ ہر ایک کی اپنی رائے ہے اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف پر دلائل ہیں۔ اس کو فقہاء کرام نے تعبیر کیا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب عوام کے اعتماد سے ہوگا، وہ نامزد نہیں ہوگا، عام لوگوں کی مشاورت اور بیعتِ عامہ کا انعقاد خلافت کی پہلی صورت ہے۔

خلیفۂ وقت کی طرف سے براہ راست نامزدگی

خلیفہ کے انتخاب کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفۂ وقت کسی کو نامزد کردے جیسے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کردیا تھا۔

خلیفۂ وقت کی منتخب کردہ شخصیات میں سے انتخاب

تیسرا طریقہ فقہاء یہ لکھتے ہیں کہ خلیفۂ وقت کی طرف سے ایک کمیٹی بنا دی جائے، خلافت کو چند آدمیوں کے درمیان محدود کردیا جائے کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنالیا جائے، جیسے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے چھ آدمی منتخب کیے تھے کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنالو، اس پر کافی وسیع مشاورت ہوئی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں میں نے تین دن تین راتیں آنکھوں میں نیند کا سرمہ نہیں لگایا، کوئی دروازہ نہیں جو میں نے نہ کھٹکھٹایا ہو، تمام لوگوں کو اعتماد میں لیا تب فیصلہ ہوا۔

اصحابِ شوریٰ کی طرف سے نامزدگی

خلیفہ کے انتخاب کی چوتھی صورت یہ ہے کہ جو اصحابِ شوریٰ موجود ہوں وہ فیصلہ کریں، جیسے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا تھا۔ مدینہ منورہ میں جو شوریٰ کے حضرات موجود تھے انہوں نے طے کیا تھا کہ حضرت علیؓ خلیفہ ہوں گے۔

اقتدار پر قبضہ کی عام قبولیت

پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخصیت اقتدار پر قبضہ کرلے اور امت اسے قبول کرلے، جیسے حضرت معاویہؓ نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا اور امت نے حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد قبول کرلیا تھا۔ حضرت معاویہؓ کو نہ منتخب کیا گیا، نہ خلیفہ نامزد کیا گیا، بلکہ انہوں نے اپنی سیاسی اور فوجی طاقت سے

اقتدار پر قبضہ کیا۔ جب حضرت حسنؓ نے بیعت کرلی تو امت نے انہیں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے طور پر قبول کرلیا۔ البتہ قبضے کے ساتھ جو خلافت قائم ہو فقہاء اس کے لیے تین شرطیں لگاتے ہیں (۱) وہ خلافت کا اہل ہو (۲) طاقت کے زور سے کیا گیا قبضہ قائم ہو جائے (۳) امت بحیثیت امت اس کے قبضہ کو تسلیم کرلے۔

دورِ حاضر میں قیامِ خلافت کی صورتیں

فقہاء نے خلافت کے انعقاد کے یہ پانچ طریقے بیان کیے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب تغیر آتا ہے اور تطبیق کی صورتیں بدلتی ہیں تو پھر ہمیں بھی اپنے موقف میں تبدیلی لانی پڑتی ہے۔ آج کے حالات میں خلافت کے انعقاد کی ان پانچ صورتوں کو دیکھیں تو تطبیق کی صورتیں صرف پہلی اور آخری نظر آئیں گی۔

- پہلی یہ کہ امت بحیثیت امت، یا امت کے اربابِ حل و عقد کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ اور خلیفہ کے انتخاب کا اولیٰ طریقہ یہی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا انتخاب اسی طریقے سے ہوا تھا۔
- یا پھر آخری طریقہ ہے کہ خلیفہ طاقت کے زور سے قبضہ کرلے، اور امت کی رائے عامہ اسے قبول کرلے۔

درمیان کی تین صورتیں تطبیق کا محل بدل جانے کی وجہ سے ممکن نہیں ہیں۔ دوسری صورت جو حضرت عمرؓ کے انتخاب کی تھی کہ انہیں خلیفۂ وقت نے نامزد کیا تھا، ظاہر ہے کہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کرنے سے پہلے خلیفہ کا وجود ضروری ہے، اور اس وقت دنیا میں کوئی شرعی خلیفہ نہیں ہے جس کی طرف سے نامزدگی ہو، اس لیے یہ صورت ممکن نہیں۔ کمیٹی والی صورت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے کہ پہلے خلیفہ موجود ہو گا تو وہ کمیٹی بنائے گا جو خلیفہ کا انتخاب کرے گی۔ چوتھی صورت کہ شوریٰ کے فیصلے سے خلیفہ منتخب ہو، جیسے حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا تھا، اور شوریٰ کا وجود بھی خلافت کے وجود کے بعد ہے، کوئی امیر ہو گا تو وہ شوریٰ بنائے گا۔ اس لیے درمیان کی تین صورتیں تطبیق کے میدان میں غائب ہو گئی ہیں۔ آج اگر کوئی خلیفہ بنے گا تو یا وہ امت کی صوابدید پر بنے گا، یا طاقت کے زور پر قبضہ کرے گا اور امت سے قبولیت کی سند حاصل کرے گا، کیونکہ قبضہ کی صورت میں شرط ہے کہ وہ خلافت کا اہل ہو اور امت اسے قبول کرلے۔ یہ میں نے خلافت کے قیام کا شرعی طریقہ کار عرض کیا ہے۔

خلافت میں فیصلوں کی بنیاد

ہر حکومت کی کوئی بنیاد ہوتی ہے، کہیں دستور اور کہیں بادشاہت۔ خلافت کی بنیاد کیا ہے اور خلافت میں فیصلے کس بنیاد پر ہوتے ہیں؟

شیخینؓ کے دو خطبے

خلافت کے نظام کو سمجھنے کے لیے کہ اس کی عملی صورت کیا تھی، اس کے لیے ہمیں تین خطبے سامنے رکھنا ہوں گے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا پہلا خطبہ، حضرت عمرؓ کا پہلا خطبہ، اور حضرت عمرؓ کا آخری خطبہ جو شہادت سے ایک ہفتہ پہلے جمعہ کو ارشاد فرمایا تھا اور بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ یہ تین خطبے ہمارے خلافت کے نظام کے عملی ڈھانچے کی بنیاد ہیں۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں یہ تینوں خطبے موجود ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے فیصلوں کی بنیاد

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے، امت نے بحیثیت خلیفہ آپ کا انتخاب کیا تو آپ نے مسجد نبوی میں جو پہلا خطاب فرمایا جسے ''پالیسی اسپیچ'' کہہ لیں کہ میں خلیفہ بنا ہوں، میں نے کیا کرنا ہے اور کس بنیاد پر کرنا ہے۔ اس خطبے میں آپ نے دو اصولی باتیں ارشاد فرمائیں۔ امرت علیکم ولست بخیرکم یہ آپؓ نے کسرِ نفسی کے طور پر فرمایا کہ مجھے تم پر امیر بنایا گیا ہے میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ حالانکہ ان سے بہتر کون تھا؟ پھر یہ اصول بیان فرمایا کہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اقودکم بکتاب اللہ وسنۃ نبیہ میں خود فیصلے نہیں کروں گا بلکہ قرآن مجید اور سنتِ نبویؐ کے مطابق فیصلے کروں گا۔ یعنی ایک اسلامی ریاست اور اس کے حکمران فیصلے کرنے میں آزاد نہیں ہیں کہ جو چاہیں فیصلہ کرلیں، بلکہ ان کو قرآن مجید اور سنتِ نبوی کی بنیاد پر فیصلے کرنا ہوں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اگر میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر آپ کو محسوس ہو کہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق نہیں چل رہا، تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ گویا حضرت صدیق اکبرؓ نے خود کو قرآن و سنت پابند کرلیا، اور بنیادی معاملات میں ان کا صوابدیدی اختیار نہیں رہا۔ اس کا سیاسی زبان میں ترجمہ یہ ہے کہ عوام اور حکومت کے درمیان کمٹمنٹ کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔ ریاست اور حکومت کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے، ریاست اور عوام کے تعلق کی بنیاد قرآن و سنت پر اور متعلقہ

مسائل میں اجتماعی مشاورت پر ہے۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اڑھائی سالہ دورِ حکومت میں فیصلے تین بنیادوں پر ہوتے رہے۔ قرآن مجید اور سنت رسول میں تلاش کرتے تھے بلکہ اعلان کرتے تھے کہ یہ مسئلہ پیش آیا ہے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث یاد ہو، آپ کا کوئی حکم یا ارشاد ہو تو بتائیں، اس پر فیصلہ ہوتا تھا اگر کسی معاملے میں حدیث بھی نہیں ملتی تھی تو پھر مشورہ کرتے تھے۔ اسلامی ریاست کی تین بنیادیں ہیں: (۱) قرآن مجید (۲) سنت رسول (۳) جن باتوں میں قرآن مجید اور سنتِ رسول سے کوئی حکم نہ ملے، اس میں اجتماعی مشاورت۔ پھر مشاورت کے دو درجے ہیں (۱) علمی مسائل میں اہلِ علم کے ساتھ مشاورت (۲) اور عوامی مسائل میں عوام کے ساتھ مشاورت۔ جہاں قرآن و حدیث کی تشریح کا مسئلہ ہوتا وہاں اہلِ علم کے ساتھ، اور جہاں لوگوں کے حقوق کا مسئلہ ہوتا وہاں عوام کے ساتھ عمومی مشاورت کرتے تھے۔

دوسری بات حضرت صدیق اکبرؓ نے اس خطبے میں یہ ارشاد فرمائی تھی ان استقمت فاعینونی و ان انا زغت فقومونی کہ اگر میں اس راستے پر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو، اور اگر میں ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ گویا حضرت صدیق اکبرؓ اپنی رعیت کو اختلاف کا حق بھی دے رہے ہیں، احتساب اور احتجاج کا حق بھی دے رہے ہیں کہ رعیت میں سے کوئی بھی اعتراض کر سکتا ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ یہ نہیں فرما رہے کہ اگر میں ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے بتا دو، بلکہ فرمایا میں ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ یہ رعیت کا حق احتساب اور حق احتجاج ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ پہلے خطبے میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ اگر حکمران قرآن و سنت کے قانون سے ہٹے تو عوام کو احتساب کا حق حاصل ہے۔

خلافت کی بنیاد حضرت صدیق اکبرؓ نے اور بعد میں حضرت عمرؓ نے یہی بیان کی قرآن مجید، سنتِ رسول اور ماضی کے صالحین کے فیصلے۔ یہ کمٹمنٹ اور معاہدہ ہے جس پر ہم نظام چلائیں گے اور اس کی خلاف ورزی پر ہم احتساب کا حق دے رہے ہیں۔ یہ تو اصول تھے، اس کی عملی صورتیں موجود ہیں کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں لوگوں کو حکومت کی پالیسی اور طرز عمل سے اختلاف ہوتا تھا اور وہ احتساب کرتے تھے، اس پر بیسیوں واقعات ہیں، چند ایک عرض کرتا ہوں۔

حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ بننے کے بعد جو سب سے بڑا مرحلہ پیش آیا وہ خلافت کی رٹ قائم کرنے

کا تھا۔ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاستِ مدینہ کا آغاز کیا تھا تو وہ بحیرہ کہلاتا تھا، مدینہ اور سمندر کے درمیان کی پٹی۔ پھر آٹھ دس سال میں پھیلتے پھیلتے جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو یمن، بحرین، یمامہ اور نجد بھی ریاستِ مدینہ میں شامل تھے۔ ریاستِ مدینہ کی حدود جزیرۃ العرب تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جزیرۃ العرب کی اس حدود کے اندر جہاں بھی بغاوت اٹھی اس کا مقابلہ کیا۔ جہاں بھی کسی نے سر اٹھایا، نبوت کے نام پر ہو یا انکارِ زکوٰۃ کے نام پر، مختلف محاذوں پر بغاوت ہو گئی تھی، جس پر حضرت صدیق اکبرؓ کو ایک سال لگا لیکن انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاست کہ یہ رٹ بحال کر لی۔ اصل کردار تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کیونکہ جزیرۃ العرب اس سے قبل ریاست کے تصور سے ناآشنا تھا۔ جزیرۃ العرب میں اجتماعی حکومت اور ریاست کا تصور حضور نبی کریمؐ نے دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے، پورے جزیرۃ العرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ جبکہ ریاست کو قائم حضرت صدیق اکبرؓ نے کیا کہ باغیوں اور مرتدین کا مقابلہ کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ ریاست اسے کہتے ہیں۔

مورخین حضرت صدیق اکبرؓ کے دو بڑے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلافت سنبھالتے ہی یہ صورتحال پیش آئی کہ کچھ نے ختم نبوت کے منکر ہو گئے، کچھ ویسے مرتد ہو گئے، اور کچھ نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان سب کے خلاف آپریشن کا فیصلہ کیا۔ منکرین ختم نبوت اور منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف بھی لڑائی جاری ہے اور مرتدین کے خلاف بھی۔ جزیرۃ العرب کی حدود میں جس نے بھی جس عنوان سے بغاوت کی حضرت صدیق اکبرؓ نے صحابہ کرامؓ کو تقسیم کر کے محاذوں پر بھیج دیا کہ جا کر لڑو۔ اس پر حضرت فاروق اعظمؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے اختلاف ہوا کہ باقی تو ٹھیک لڑ رہے ہیں لیکن جو زکوٰۃ نہیں دیتے آپ ان سے کیوں لڑتے ہیں؟ باقی کسی کے بارے میں حضرت عمرؓ نے اعتراض نہیں کیا۔ منکرینِ زکوٰۃ کے متعلق حضرت عمرؓ کو تحفظات تھے کہ یہ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، باقی سارے کام مسلمانوں والے کرتے ہیں، صرف زکوٰۃ ہی نہیں دیتے تو اس میں لچک پیدا کریں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے بحث و مباحثہ کیا۔ دلیل یہ دی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے امرت ان اقاتل الناس حتٰی یقولوا لا الہ الا اللہ مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم ہے جب تک وہ کلمہ نہ پڑھ لیں فمن قال لا الہ الا اللہ فقد عصم منی مالہ و نفسہ و حسابہ علی اللہ جس نے کلمہ پڑھ لیا اس نے اپنی جان بھی بچا لی اور مال بھی بچا لیا۔ وہ میری لڑائی

کے زد میں نہیں آئے گا، جس نے کلمہ پڑھ لیا وہ میرا محارب نہیں ہے، میں اس سے نہیں لڑوں گا۔ اور یہ منکرینِ زکوٰۃ تو کلمہ پڑھتے ہیں پھر ہم ان کے ساتھ قتال کیوں کریں؟

میں کہا کرتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلے سے اختلاف ہوا تو انہوں نے حدیث سے دلیل دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں اسی حدیث کا ایک جملہ نقل کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا عمر، دیکھو! حضور نبی کریمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے الا بحق الاسلام جہاں اسلام کا تقاضا ہو گا وہاں لڑوں گا۔ جو حدیث حضرت عمرؓ کی دلیل ہے وہی حدیث حضرت ابوبکرؓ کی دلیل ہے۔ عمومی طور پر لوگوں کی جان اور مال محفوظ ہو گیا ہے لیکن جہاں اسلام کا تقاضا ہو گا وہاں قتال کیا جائے گا۔ مثلاً اگر کسی نے دوسرے کو قتل کیا ہے تو قصاص میں قتل ہو گا، اگر کسی پر رجم کی سزا ہے تو نافذ ہو گی۔ فرمایا کہ فان الزکوٰۃ حق الاسلام زکوٰۃ بھی اسلام کا حق ہے۔ جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا، اللہ کی قسم میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے یہ موقف تسلیم کر لیا اور فرمایا شرح اللہ صدری کما شرح صدر ابی بکر اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ بھی کھول دیا جیسے ابوبکر کا سینہ کھولا تھا۔ فعرفت انہ الحق مجھے سمجھ آگئی ہے کہ حضرت ابوبکر کا فیصلہ برحق ہے۔

یہ واقعہ میں نے اس حوالے سے ذکر کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ میں اگر کسی حوالے سے اختلاف ہوتا تو دلیل قرآن و حدیث سے دی جاتی۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس فیصلے کی بنیاد حدیثِ نبوی پر ہے۔

حضرت عمرؓ کے فیصلوں کی بنیاد

اسی پر دوسرا حوالہ دینا چاہوں گا کہ خلیفہ راشد کے فیصلے سے اختلاف قرآن مجید کی آیت کی بنیاد پر کیا گیا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے ایک قانون نافذ کیا کہ لوگ مہر میں بڑی بڑی رقمیں طے کر لیتے ہیں، پھر ادائیگی میں جھگڑے ہوتے ہیں، اس لیے میں نے مہر کی رقم متعیّن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اعلان کر دیا کہ کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اگر کسی شادی میں چار سو درہم سے زیادہ مہر دیا گیا تو زائد رقم ضبط کر کے بیت المال میں جمع کر لی جائے گی۔

خلیفہ راشد، امیر المومنین نے یہ آرڈر جاری کر دیا۔ جب آپؓ جمعہ پڑھا کر باہر نکلے تو راستے میں ایک قریشی خاتون نے روک لیا۔ اور کہنے لگی حضرت! آپ نے مہر کی رقم پر پابندی لگا دی ہے اور کہا ہے کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اگر زیادہ دیا گیا تو زائد رقم ضبط کر لی جائے گی۔ حضرت عمرؓ نے

فرمایا، ہاں میں نے یہ اعلان کیا ہے۔ اس عورت نے کہا کہ آپ کو اس کا اختیار کس نے دیا ہے، کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ حضرت عمرؓ کو گویا پریشر بریک لگ گئی کہ یہ میرے فیصلے پر اعتراض کر رہی ہے اور حوالہ قرآن سے دے رہی ہے۔ خاتون نے کہا کہ خاوندوں سے بیویوں کو جو ملتا ہے قرآن مجید نے اس کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے فان اٰتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئا اگر تم نے بیویوں کو قنطار برابر دولت بھی دے دی ہے تو واپس نہ لو۔ اس عورت نے حضرت عمرؓ کے سامنے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا کہ قرآن مجید ہمیں خاوندوں سے ڈھیروں دلواتا ہے، اور آپ کہتے ہیں کہ چار سو درہم سے زیادہ نہ دیں۔ حضرت عمرؓ کو بات سمجھ آ گئی، چنانچہ وہیں سے واپس مسجد میں گئے، وہاں جو لوگ موجود تھے ان سے کہا کہ میں نے ابھی خطبے میں ایک اعلان کیا تھا، ایک خاتون نے مجھے توجہ دلائی ہے اور قرآن مجید کی آیت کا حوالہ دیا ہے، بخدا میرا دھیان ادھر نہیں تھا امرۃ اصابت واخطأ رجل وہ بی بی ٹھیک کہتی ہے مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ یہاں حضرت عمرؓ نے ایک جملہ دل لگی اور خوش طبعی کے طور پر فرمایا کہ اب تو مدینے کی عورتیں عمر سے بھی زیادہ قرآن جاننے لگی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اگلے جمعہ کا انتظار نہیں کیا بلکہ انہی قدموں پر واپس پلٹے اور اپنا فیصلہ واپس لیا۔

الغرض خلفائے راشدین کے زمانے میں فیصلوں کی بنیاد قرآن مجید اور سنتِ رسول ہوتی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کی زبان میں پہلے بزرگوں کے فیصلے بھی اس بنیاد میں شامل ہیں، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

عوام کا حقِ احتساب

جو بات حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمائی تھی وہی بات حضرت عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمائی۔

حضرت عمرؓ کے کرتے کا معاملہ

آپؓ نے اپنے اوپر دو پابندیاں لگائیں کہ میں قرآن مجید اور سنتِ رسول کی پابندی کروں گا، اور اپنے پیشرو حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کا احترام کروں گا کہ ان کے فیصلوں کو بلاوجہ ”ری اوپن“ نہیں کروں گا۔ پھر سوالیہ انداز میں فرمایا اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو، اور اگر میں ٹیڑھا چلنے لگوں تو کیا کرو گے؟ اس پر ایک اعرابی کھڑا ہو گیا، اس نے تلوار نیام سے نکال کر لہرائی اور حضرت عمرؓ فاروق سے کہا، اے خطاب کے بیٹے! اگر آپ قرآن وسنت کے مطابق چلے تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے، اور اگر

ٹیڑھے چلے تو ہم آپ کو اس تلوار کے ساتھ سیدھا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کوئی سزا نافذ نہیں کی۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بات کرنے والا بندہ بعد میں اس کے گھر والوں کو تلاش نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکرادا کیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری رعیت میں ایسے افراد موجود ہیں جو عمر کو بھی تلوار کے ساتھ سیدھا کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ گویا حضرت عمرؓ بھی عوام کے حقِ احتساب اور حقِ احتجاج کی تصدیق کر رہے ہیں کہ خلیفہ کی بات پر احتساب کا حق بھی ہے اور احتجاج کا حق بھی ہے۔

اسی احتساب پر ایک مشہور واقعہ عموماً ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا یا ایھا الناس! تو اس پر ایک اعرابی کھڑا ہو گیا اس نے کہا لا سمع ولا طاعۃ کہ ہم نہ آپ کی بات سنتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے جو کرتا پہنا ہوا ہے یہ کدھر سے آیا ہے؟ بیت المال سے جو کپڑا ملا تھا، اس سے میرا کرتا تو نہیں بنا اور آپ کا کرتا بن گیا ہے، حالانکہ آپ کا قد بھی مجھ سے لمبا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اٹھ کر جواب دیا کہ میرا اور ابا جان دونوں کا کپڑا مل کر یہ کرتا بنا ہے۔ اس پر اس اعرابی نے کہا ٹھیک ہے، آپ فرمائیں، ہم آپ کی بات سنیں گے بھی اور آپ کی بات مانیں گے بھی۔ یہ حقِ احتساب کی ایک صورت یہ ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قصہ

احتساب کی دوسری صورت بخاری شریف میں یہ ذکر ہوئی ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو حضرت عمرؓ نے کوفے کا گورنر بنایا تھا۔ حضرت سعدؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اکابر صحابہ میں سے تھے۔ ان کے خلاف شکایت آ گئی۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو انکوائری آفیسر مقرر کیا کہ جا کر انکوائری کرو کہ کیا یہ شکایت درست ہے؟ اس وقت کوفہ میں چالیس کے لگ بھگ مسجدیں تھیں۔ محمد بن مسلمہ نے جا کر یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ ایک مسجد میں جاتے، گورنر صاحب آپ کے ساتھ ہوتے، نماز کے بعد کہتے کہ میں انکوائری کے لیے آیا ہوں، یہ آپ کے گورنر ہیں، اگر آپ میں سے کسی کو ان سے شکایت ہو تو بیان کرے۔ لوگ کہتے کہ یہ ہمارے بڑے ہیں، ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کوفہ کی ساری مسجدوں میں تین چار دن انکوائری کی۔ آخری دن ایک مسجد میں یہی سوال کیا تو ایک بوڑھا کھڑا ہو گیا، اس نے کہا مجھے شکایت ہے۔ اس نے گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں

تین شکایتیں بیان کیں۔ اس نے کہا پہلی بات یہ ہے کہ یہ بیت المال سے ہمیں ہمارا پورا حصہ نہیں دیتے۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ یہ لوگوں کو جہاد کے لیے بھیج دیتے ہیں، خود نہیں جاتے۔ اور تیسری شکایت یہ ہے کہ نماز صحیح نہیں پڑھاتے اور قرآن صحیح نہیں پڑھتے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بڑی شخصیت تھے لیکن جلالی بزرگ تھے۔ انکوائری آفیسر محمد بن مسلمہ نے گورنر صاحب سے پوچھا کہ آپ کا کیا جواب ہے؟ حضرت سعدؓ غصے میں آ گئے اور کہا میں کوئی صفائی نہیں دیتا۔ اور شکایت کرنے والے کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اگر تو مجھ پر جھوٹے الزام لگا رہا ہے تو اطل عمرہ و اطل فقرہ وعرضہ بالفتن۔ اسے لمبی عمر دے، لمبا فاقہ دے اور اسے فتنوں میں مبتلا کر۔ یہ بڑی خوفناک بددعا ہے جو حضرت سعدؓ نے اسے دی۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے فرمایا کہ آپ واپس آ جائیں، میں کسی اور کو کوفہ بھیج دیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو مدینہ واپس بلا لیا۔ اس کو تاریخ کہتی ہے کہ انہیں معزول کر دیا، یہ درست نہیں ہے، اس کی صفائی حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے دی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کی شہادت کا وقت قریب آیا، زخمی حالت میں تھے، طبیبوں نے کہہ دیا کہ کوئی وصیت وغیرہ کرنی ہے تو کر دیں، ہماری طرف سے تو خطرہ ہے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کی کمیٹی بنائی کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنا لینا۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد، حضرت سعید اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم۔ ان چھ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے۔ فوراً خیال آیا کہ حضرت سعدؓ کو تو میں نے گورنری سے واپس بلا لیا تھا، اس پر کوئی اعتراض نہ کر دے کہ گورنر تو نہیں بن سکتے تھے، امیر المومنین کیسے بن سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے وضاحت کی کہ میں نے سعد کو کوفے سے اس لیے واپس نہیں بلایا تھا کہ وہ شکایت درست تھی، بلکہ ان کے احترام کی خاطر واپس بلایا تھا کہ بزرگ آدمی ہیں، خواہ مخواہ کوئی توہین کرے گا۔

حضرت عثمانؓ کی کھلی کچہری

احتساب کی ایک صورت حضرت عثمانؓ نے اختیار کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت ساڑھے بارہ سال ہے۔ جب حکومت لمبی ہو جاتی ہے تو شکایتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اسی طرح جوں جوں حکومت پھیلتی رہتی ہے تب بھی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے پاس بھی گورنروں کے خلاف شکایتیں آتی تھیں۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی شہادت سے ایک سال پہلے پوری سلطنت میں اعلان کروایا

کہ میں حج کے موقع پر منیٰ میں ساری شکایتیں سنوں گا اور فیصلے کروں گا، لہٰذا جس کسی کو کسی گورنر کے خلاف یا میرے خلاف کوئی شکایت ہے وہ حج پر آ جائے، منیٰ میں کھلی کچہری لگے گی۔ چنانچہ حج کے موقع پر منیٰ میں پورا دن کھلی کچہری لگی۔ حضرت عثمانؓ اور ان کے گورنر بھی موجود تھے، شکایات ہوتی رہیں، آپ سنتے رہے۔ ایک گورنر کے خلاف شکایت درست نکلی تو اس کو سزا بھی دی۔ تفصیلات میں نہیں جاتا لیکن حضرت عثمانؓ کی طرف سے یہ اہتمام ہوا کہ پوری سلطنت میں اعلان کر کے حج کے موقع پر کھلی کچہری لگا کر سب شکایات سنیں، اور جو شکایت درست تھی اس پر کاروائی بھی کی۔ یہ حق احتساب تھا۔ قرآن وسنت کے ساتھ کمٹمنٹ اور عوام کا حقِ احتساب، اسی پر خلافت کی بنیاد ہے۔

اسی حقِ احتساب پر حضرت معاویہؓ کے زمانے کے دو اعتراضات ذکر کروں گا۔ حضرت معاویہؓ صحابہ کرام میں سب سے لمبی حکومت کرنے والے ہیں۔ مجموعی طور پر آپؓ نے پینتالیس سال حکومت کی ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بیس سال شام کے گورنر رہے، اس کے بعد ساڑھے چار پانچ سال حضرت علیؓ کے ساتھ کشمکش رہی، اور جب حضرت حسنؓ نے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تو اس کے بعد ساڑھے انیس سال آپؓ ساری امت کے متفقہ خلیفہ رہے۔ اس دور کے دو واقعات روایات میں ملتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کا رومیوں کے ساتھ جنگی بندی کا معاہدہ

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ کا رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ تھا۔ اس وقت رومی سلطنت قائم تھی جو کہ ترکوں کی خلافت تک قائم رہی ہے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تب رومی سلطنت ختم ہوئی۔ حضرت معاویہؓ اور رومیوں کا آپس میں کچھ عرصے کے لیے جنگ نہ کرنے معاہدہ تھا۔ جنگ بندی کی مدت متعیّن تھی۔ مقررہ مدت ختم ہونے سے کچھ عرصہ پہلے حضرت معاویہؓ نے ایک تدبیر سوچی کہ جنگ نہ کرنے کے معاہدے میں جنگ نہ کرنا شامل ہے، ہم اس معاہدے کی پابندی کریں گے، لیکن اس دوران اپنے ملک میں فوجیں گھمانا پھرانا تو منع نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے تکنیکی پہلو اختیار کیا کہ ہم سرحد پر پہنچ جاتے ہیں، جونہی مدت ختم ہوگی ہم حملہ کر دیں گے تاکہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہو۔ یہ جنگی چال تھی، چنانچہ اس کے مطابق دمشق سے لشکر لے کر چل پڑے، ایک یا دو دن کا سفر ہو چکا تھا۔ اچانک دمشق کی جانب سے ایک آدمی بہت تیز رفتار گھوڑا دوڑاتے ہوئے شور مچاتے ہوئے آ رہا تھا۔ یہ اس زمانے میں بریکنگ نیوز ہوتی تھی اور اس بات کی علامت ہوتی

تھی کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے، کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ ٹھہرو پتا کرتے ہیں کون ہے۔ آنے والے کا انتظار کیا، جب وہ قریب آئے تو معروف صحابی عمرو بن عبسہؓ تھے جو للکارتے ہوئے آ رہے تھے معاویہ! وفاء لا غدر معاہدہ پورا کرنا چاہیے، توڑنا نہیں چاہیے۔ فوج کا روم کی سرحد کی طرف رخ تھا۔

جب وہ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے، سلام دعا ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے پوچھا خیر تو ہے؟ عمرو بن عبسہؓ نے پوچھا حضرت! یہ لشکر لے کر کہاں جا رہے ہیں، آپ کا رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ نہیں ہے؟ حضرت معاویہؓ نے کہا، معاہدہ ہے۔ عمرو بن عبسہؓ نے پوچھا کتنے عرصے کا معاہدہ ہے؟ حضرت معاویہؓ نے مدت بتائی تو انہوں نے پوچھا کیا یہ مدت ختم ہو گئی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو عمرو بن عبسہؓ نے کہا کہ پھر آپ کیوں روم کی سرحد کی طرف جا رہے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں معاہدہ ختم ہونے سے پہلے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کروں گا صرف فوجیں بارڈر پر لے جا رہا ہوں تاکہ معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی ہم حملہ کر دیں۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو تو جب تک معاہدے کی مدت ختم نہ ہو جائے فوجوں کو اپنے مرکز سے حرکت مت دو۔ اس لیے آپ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے صرف یہ سوال کیا أأنت سمعت؟ کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ سے خود سنی ہے؟ یہ سوال اس لیے کیا کہ ہو سکتا ہے کسی اور سے سنا ہو اور سننے میں غلطی ہو گئی ہو۔ انہوں نے کہا سمعت اذنای و وعاہ قلبی میرے ان کانوں نے سنی ہے اور سینے نے یاد رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے لشکر کو آرڈر دے دیا کہ واپس چلو، یہاں تک ہماری چال تھی، اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سامنے آ گیا ہے لہٰذا اب کوئی چال کوئی ڈپلومیسی نہیں چلے گی۔ چنانچہ وہیں سے فوجیں واپس ہوئیں اور دمشق جا کر سانس لیا۔

یہ نظامِ خلافت میں عوام کا حقِ احتساب ہے کہ عام شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ کو جا کر روک لے کہ جناب! آپ یہ غلط کر رہے ہیں۔ اور خلیفہ اگر محسوس کرے کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے تو وہ اپنی بات پر اڑے نہیں بلکہ یوٹرن لے اور حق کی طرف واپس آئے۔

حضرت معاویہؓ کا بیت المال کے متعلق اعلان

طبرانی کی روایت میں حضرت معاویہؓ کا دوسرا واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ سند صحیح

کے ساتھ ہے۔ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے دمشق کی جامع مسجد میں جمعہ کے خطبے کے دوران یہ بات کہہ دی المال مالنا والفیئ فیئنا من شئنا اتیناہ ومن شئنا منعناہ۔ بیت المال ہمارے کنٹرول میں ہے، ہم جس کو چاہیں گے دیں گے، جس کو نہیں چاہیں گے نہیں دیں گے، بیت المال کا مال اور غنیمت کا مال ہماری مرضی سے تقسیم ہو گا۔ لوگوں نے یہ بات سن لی۔ اگلے جمعہ کو خطبے میں آپ نے پھر یہ بات دہرا دی کہ مال تقسیم کرنے میں ہماری مرضی چلے گی، کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ لوگوں نے بات سن لی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آپؓ نے تیسرے جمعہ میں پھر وہی بات دہرا دی۔ اس پر ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ آپ تیسرے جمعہ سے یہ کیا بات کہہ رہے ہیں؟ بیت المال نہ آپ کا ہے نہ آپ کے باپ کا ہے، آپ نے عوام کے حقوق میں دخل اندازی کی تو آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ یہ لوگوں کا حق ہے، آپ کو لوگوں کا حق دینا پڑے گا، اس میں آپ اپنی مرضی نہیں کر سکتے۔ جمعہ کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس آدمی کو اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ جو طلبی ہوئی ہے اللہ خیر کرے، بات چھوٹی نہیں ہے کہ اس نے جمعہ کے خطبے کے دوران ٹوک دیا کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں، ہم آپ کی یہ بات نہیں مانیں گے، اس لیے ہمیں چلنا چاہیے، اگر کوئی بات سختی کی ہوئی تو ہم سفارش کریں گے کہ اس کی بات ٹھیک ہے اور اگر بالفرض معاملہ بگڑا تو ہم مداخلت کریں گے، اس خیال سے کچھ لوگ پیچھے پیچھے چل پڑے۔

جب یہ لوگ اندر پہنچے، سلام دعا ہوئی تو دیکھا کہ حضرت معاویہؓ نے اس آدمی کو اپنی مسند پر بٹھایا ہوا ہے اور خود سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں ان ھذا احیانی احیاہ اللہ اس شخص نے مجھے زندگی دی ہے اللہ اسے زندہ رکھے۔ حضرت معاویہؓ اس کا شکریہ ادا کر رہے ہیں اور اسے دعا دے رہے ہیں۔ جب لوگ اکٹھے ہوئے تو انہوں نے پوچھا کہ حضرت! قصہ کیا ہے؟ اس پر حضرت معاویہؓ نے کہا میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنا تھا کہ میرے بعد کسی دور میں کچھ حکمران ایسے ہوں گے کہ جو اُن کے جی میں آئے گا کہہ دیں گے، ان کو کوئی روکنے کی ہمت نہیں کرے گا، ایسے حکمران جہنم میں بندروں کی طرح چھلانگیں لگائیں گے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے سوچا کہ کہیں میں تو ان میں سے نہیں ہوں، اس لیے میں نے تین جمعے یہ اعلان کیا کہ یہ غلط بات کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کوئی مجھے ٹوکتا ہے یا نہیں۔ میں نے پہلے جمعہ میں یہ بات کی، مگر کسی نے روک ٹوک نہیں کی تو میں گھبرا گیا کہ مسئلہ گڑبڑ ہے۔ پچھلے جمعہ پھر میں نے بات دہرا دی مگر کوئی نہیں بولا تو مجھے پریشانی ہوئی کہ کہیں میں

اس کھاتے میں تو نہیں ہوں۔ آج میں نے پھر وہی بات کہی تو اس نے کھڑے ہو کر مجھے ٹوکا۔ اللہ اسے زندگی دے، اس نے مجھے اس کھاتے سے نکال دیا اور مجھے نئی زندگی دی ہے ورنہ میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا کہ میں اتنی غلط بات کہہ رہا ہوں اور کوئی بول ہی نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ اس کو لمبی زندگی عطا کرے، اس نے مجھے اس دائرے سے نکال دیا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایسے حکمران ہوں گے جو جہنم میں بندروں کی طرح چھلانگیں لگائیں گے۔

میں نے یہ واقعات اس پر ذکر کیے ہیں کہ خلفاء کا احتساب ہوتا تھا، لوگ ان کو روکتے ٹوکتے تھے، خلفاء ان کی بات سنتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ جناب نبی کریمؐ نے بھی امیر کی بہترین خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ سب سے اچھا امیر وہ ہے جسے لوگ اچھا سمجھیں۔ اور سب سے برا امیر وہ ہے جس کو لوگ برا سمجھیں اور اسے برا کہہ نہ سکیں، جس کی بات لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہو لیکن ٹوکنے کا حوصلہ بھی نہ ہو، اس کے سامنے اس کی غلطی کا اظہار نہ کر سکیں۔

خلافت کے نظام میں عوام کا حقِ احتساب مستقل اصول ہے کہ اگر خلیفہ غلط بات کر رہا ہو یا غلط کام کر رہا ہو تو عوام میں سے ہر شہری کا حق ہے کہ وہ اس کو ٹوکے اور اسے بتائے کہ آپ غلط کر رہے ہیں، آپ کی یہ بات شریعت کے فلاں حکم یا فلاں قانون کے خلاف ہے۔

خلافت کے معیارات

خلافت کا تاریخی تناظر کہ کیسے خلافت کا آغاز ہوا، خلافت کن کن ادوار سے گزری، اور خلافت کے مختلف معیارات جو تاریخ میں تقریبا بارہ تیرہ سو سال چلتے رہے، وہ کیا تھے؟ اس حوالے سے یہ کہنا چاہوں گا کہ خلافت کے ادوار جو تاریخی اعتبار سے کہلاتے ہیں، ان میں خلافتِ راشدہ، خلافتِ امویہ، خلافتِ عباسیہ اور خلافتِ عثمانیہ کے ادوار ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت کے ہاں خلافتِ راشدہ کا دور اصطلاحاً تیس سال کا دور کہلاتا ہے جس میں حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا دورِ حکومت اور حضرت حسنؓ کے چھ مہینے ہیں۔ دوسرا دور خلافتِ بنوامیہ کا ہے جس کا آغاز حضرت معاویہؓ سے ہوا، اور ان کے بعد خلافت بنو عباس کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا، یہ خلافت تقریباً نوے سال چلی ہے۔

ایک بڑا نازک مسئلہ جس پر ہمارے متکلّمین نے بھی بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ اور باقی خلافتوں میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو جاننے سے پہلے آپ ایک اور فرق دیکھیں کہ ہمارے ہاں اسلامی حکومتیں تین درجوں کی رہی ہیں۔ ایک کو مثالی طرزِ خلافت کہا جا سکتا ہے۔ دوسری معیاری اسلامی حکومت و خلافت ہے۔ اور تیسری جواز کے درجے کی اسلامی حکومت ہے۔ ہمارے ہاں تیرہ سو سال تقریباً یہ تینوں درجے قائم رہے ہیں، بلکہ زیادہ تر تیسرا درجہ رہا ہے یعنی ایک قابلِ قبول اسلامی ریاست یعنی ایسی اسلامی حکومت جس کے خلاف فقہاء نے خروج کو جائز نہیں کہا۔

مثالی طرزِ حکومت

آئیڈیل اور مثالی دور تو خلافتِ راشدہ کا ہے۔ راشدہ کی اصطلاح کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ باقی خلافتیں غیر راشدہ ہیں، یہ ہمارے ہاں عام طور پر مغالطہ پایا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کی خلافت کو خلافت راشدہ قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے بعد جو حضرت معاویہؓ کی بیس سال حکومت رہی تو ان کی خلافت غیر راشدہ ہے، وہ بھی راشدہ خلافت ہے یعنی رشد و ہدایت کے معیار پر پوری اترتی ہے۔

لیکن درجہ بندی میں خلافتِ راشدہ ایک اصطلاح ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور باقی متکلّمین نے اس پر بحث کی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ اسلامیہ یا خلافتِ عامہ میں صرف ایک درجے کا فرق ہے کہ وہ ایک درجہ بہتر ہے اور یہ ایک درجہ کم ہے۔

خلافتِ راشدہ انتہائی مثالی درجہ کی خلافت ہے جو ہمارے ہاں آئیڈیل درجہ ہے جس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الخلافة بعدی ثلاثون سنة کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی۔ لیکن اس کے بعد حضرت معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت بھی معیاری خلافت ہے، اصطلاحاً نہ سہی لیکن لغۃً وہ بھی خلافتِ راشدہ ہے۔ خلافتِ مطلقہ اور خلافتِ عامہ میں بنوامیہ کا پورا دور گزرا، ایک آدھ کو چھوڑ کر اس کا درجہ حضرت معاویہؓ کی حد تک معیاری اور اس کے بعد قابلِ قبول اسلامی ریاست کا ہے جسے ضرورتاً تسلیم کیا گیا۔ بنوامیہ کے بعد بہت سی حکومتیں اس درجہ میں شامل ہیں۔

اگر اسے ایک اور حوالے سے تقسیم کریں تو میں اپنے ذوق کے مطابق کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرات صحابہ کرامؓ کو معیارِ حق قرار دیا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین کے تمام معاملات میں صحابہ کرامؓ ہی کو معیار فرمایا ہے۔ دین اور احکام کے دو درجے ہوتے ہیں:

ایک عزیمت کا درجہ ہوتا ہے اور ایک رخصت کا درجہ ہوتا ہے۔ میں عام طور پر یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ عزیمت اور رخصت کے دونوں دور اللہ رب العزت نے ہمیں عملی طور پر صحابہ کرامؓ کے دور میں دکھائے ہیں۔ خلافتِ راشدہ عزیمت کی بنیاد پر ہے اور خلافتِ امیہ کا پہلا دور حضرت معاویہؓ کا دور کچھ رخصتوں کا دور ہے۔ اللہ رب العزت نے عزیمت اور رخصت کے دونوں دائرے تکوینی طور پر صحابہ کرامؓ کے دور میں ہمارے سامنے رکھے ہیں کہ عزیمت پر چلنا ہو تو وہ مثال ہے اور رخصتوں سے فائدہ اٹھانا ہو تو یہ مثال ہے۔ تاہم دونوں حق ہیں اور دونوں ہمارے لیے معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

معیاری طرزِ حکومت

خلافتِ بنوامیہ کا آغاز حضرت معاویہؓ سے ہوا۔ حضرات صحابہ کرام میں حضرت معاویہؓ کی سب سے لمبی حکومت رہی ہے۔ آپ کے بھائی حضرت یزید بن ابی سفیانؓ فاتحینِ شام میں سے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت یزید بن سفیانؓ کو شام کا گورنر بنایا تھا، ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا گورنر بنا دیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ تقریباً

بیس سال شام کے گورنر رہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہ عمرو بن الجراحؓ اور حضرت یزید بن ابی سفیانؓ ان تین جرنیلوں نے مختلف اطراف سے شام پر حملہ کر کے شام کو فتح کیا تھا تو حضرت عمرؓ نے ان میں سے حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کا گورنر مقرر فرما دیا تھا۔ اس پر ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ فاتحین شام میں سے ہیں۔ تاریخ ابن عساکر میں درج ہے کہ حضرت خالدؓ حمص میں آباد ہو گئے تھے، باقی عمر انہوں نے وہیں گزاری، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ایک دن ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، ہلکے سے شکوے کے انداز میں کہنے لگے کہ ہم نے لڑ لڑ کر شام فتح کیا، جب شام کی گندم اور شہد مدینہ پہنچنا شروع ہو گیا تو امیر المومنین نے وہاں گورنر کسی اور کو بنا دیا اور مجھے کہتے ہیں کہ غزوۂ ہند کی تیاری کرو۔ مجلس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ساتھی نے عرض کیا کہ آپ انکار کر دیں کہ میں نہیں جاتا، میرا خاصا وقت گزر گیا ہے، اب میں نہیں جا سکتا۔ تو مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی نے کہا کہ اس سے تو فتنہ کھڑا ہو گا کہ حضرت عمرؓ ان کو حکم دیں کہ جاؤ جہاد ہند کے لیے، اور آپ کہیں کہ میں نہیں جاتا۔ اس پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے بڑے مزے سے ایک جملہ فرمایا اما فی عهد عمر فلا کہ پریشان نہ ہو، حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو گا، یعنی ان کے ہوتے ہوئے کسی فتنے کا ڈر نہیں ہے۔

مجموعی طور پر حضرت معاویہؓ کا پینتالیس سالہ دورِ حکومت ہے۔ بیس سالہ گورنری کا دور ہے، پھر جب حضرت حسنؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے خلافت ان کے حوالے کی اور انہیں امیر المومنین تسلیم کیا تو اس کے بعد ساڑھے انیس یا بیس سال آپؓ کی خلافت کا دور ہے جس میں آپ نے بحیثیت امیر المومنین دنیا پر حکومت کی ہے۔

جبکہ درمیان کے ساڑھے چار پانچ سال جب وہ حضرت علیؓ کے متوازی امیر رہے، یہ متنازعہ دور ہے۔ پہلا بیس سالہ گورنری کا دور بھی متفق علیہ ہے اور بعد کا بیس سالہ دور خلافت بھی متفق علیہ ہے۔ درمیان میں ساڑھے چار سال کا دور جس میں ایک طرف کوفے میں حضرت علیؓ امیر تھے اور شام میں حضرت معاویہؓ امیر المومنین کی حیثیت سے متوازی امیر تھے، یہ متنازعہ دور ہے، جس کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے ائمہ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ صواب پر تھے اور حضرت معاویہؓ خطا پر تھے۔ لیکن چونکہ آپؓ مجتہد تھے اس لیے مجتہد کی خطا بھی اس کو اجر و ثواب سے محروم نہیں کرتی۔ اس ساڑھے

چار سال کے دور میں جمہور اہلِ سنت بلکہ سارے ہی اہلِ سنت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کرتے ہیں۔

خلافت بنوامیہ کا آغاز حضرت معاویہؓ سے ہوا اور تقریباً نوے سال ان کے خاندان نے حکومت کی۔ سیاسی طور پر تبدیلی یہ آئی کہ خلافت ِراشدہ میں جانشینی خاندانی نہیں تھی۔ خلافتِ راشدہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ایک دوسرے کے نسبی وارث نہیں تھے، لیکن حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کیا، اس کی سیاسی مصالح جو بھی ہوں، لیکن یہ پہلی روایت سے مختلف روایت تھی۔ جس پر سب سے پہلا اعتراض حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کیا۔ بہت سے صحابہ کرامؓ کو اس فیصلے سے اختلاف تھا، لیکن جب وہ امیر المومنین تسلیم ہو گئے اور اس کے بعد ان کا حکم نافذ ہوا تو وہ دوسری حیثیت ہے۔ لیکن خلافت کو خاندان میں محصور کر دینے پر حضرت معاویہؓ پر اعتراض ہوا تھا اور بہت سے صحابہ کرامؓ کے اس پر تحفظات تھے۔

جوازی طرزِ حکومت

بنوعباس آئے تو بنوامیہ کے خلاف کشمکش چلتی رہی۔ حضرت حسنؓ کی اولاد اور حضرت حسینؓ کی اولاد ان کے بیٹے ابراہیم نفس ذکیہ، امام زید بن علی اور دیگر حضرات رحمہم اللہ تعالیٰ بنوامیہ کے خلاف مختلف محاذوں پر سرگرم رہے۔ بالآخر بنوعباس میں سے عبداللہ سفاح کی بغاوت کامیاب رہی اور انہوں نے بنوامیہ کی خلافت ختم کر کے بنوعباس کی خلافت قائم کی۔ بنوعباس میں بھی خاندانی بنیاد پر خلافت چلتی رہی۔ ان میں ہارون الرشید اور اور دوسرے اچھے اچھے خلیفہ بھی آئے۔ جبکہ مامون الرشید معتزلی ہو گیا تھا۔

بنوعباس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے آنے سے ایک اور فرق قائم ہوا کہ بادشاہوں اور شاہی خاندان کے رہن سہن کا انداز تبدیل ہو گیا۔ خلفائے راشدین کا طرزِ معاشرت اور تھا۔ بنوامیہ، بنوعباس اور بنو عثمان کے خلفاء کا طرز معاشرت اور تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اصلاحات

خلفائے راشدین کا معیار سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اور کسی کا نہیں تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پرانا طرز معاشرت اور طرزِ معیشت اختیار کرنے کی کوشش کی اور اصلاحات نافذ کیں،

جنہیں آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ ان اصلاحات کی بنیاد پر آپ کو عمرِ ثانی کہا جاتا ہے، ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ کا تتمہ کہا جاتا ہے، اور ان کو تیرہ سو سال سے مسلسل خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے سہولتیں، زندگی کا آرام اور تعیش ترک کر دیا اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت اور طرزِ خلافت پر واپس چلے گئے، اس لیے ان کو اس حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے دور خلافت میں جو اصلاحات نافذ کیں، ان میں سے دو تین ذکر کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو کہ وہ تبدیلی کیا تھی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو سلیمان بن عبد الملکؒ نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ان کے بھتیجے تھے۔ سلیمان اموی خلیفہ تھے، ان کے والد محترم عبد الملک امیر المومنین تھے، ان کے والد محترم حضرت مروانؒ امیر المومنین تھے۔

سلیمان بن عبد الملکؒ کی وفات اور تدفین کے بعد دمشق کی جامع مسجد میں اعلان ہوا کہ انہوں نے عمر بن عبد العزیزؒ کو اپنا جانشین نامزد کیا ہے اور اب وہ امیر المومنین ہیں، اور لوگوں کو جمع کر کے کہا گیا کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں یہ خلافت تمہیں واپس کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ نامزدگی کی خلافت ہے اور ہمارے ہاں اسلامی اصول نامزدگی نہیں بلکہ مشورہ ہے، چونکہ اس میں عوام کی مشاورت شامل نہیں ہے، اس لیے میں خلافت واپس کرتا ہوں اور تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ اپنی مرضی سے جس کو چاہو امیر المومنین منتخب کر لو۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دمشق کی جامع مسجد میں اس اجتماع کے سامنے جو ان کے ہاتھ پر بیعت کے لیے جمع ہوا تھا، یہ اعلان فرمایا کہ تمہاری مرضی ہے جس کو چاہو امیر المومنین منتخب کر لو، میں بھی اسی کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ اس اجتماع میں اصحابِ شوریٰ بھی تھے، عوام بھی تھے، سب لوگ جو وہاں موجود تھے، انہوں نے بیک آواز کہا کہ اگر ہم نے فیصلہ کرنا ہے تو ہمارا فیصلہ بھی یہ ہے کہ ہمارے امیر المومنین آپ ہیں اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔

میں نے ایک تبدیلی ذکر کی ہے کہ بعد کی خلافتوں میں خلافتِ راشدہ سے یہ تبدیلی آئی، جس کی نشاندہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اعلان کر کے کی۔

اس کے بعد دوسری اصلاح جو انہوں نے کی، جس کی بنیاد پر انہیں عمر ثانی کہا جاتا ہے، وہ ذکر کرتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ مدینہ منورہ کے گورنر رہے ہیں۔ ان کے والد محترم عبد العزیز بن مروان بڑے جرنیلوں میں سے اور بڑی شخصیات میں سے تھے۔ آپؒ بھی مدینہ منورہ کے گورنر رہے

ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تعیش کا وہ زمانہ گزارا ہے کہ جب مدینہ سے دمشق آتے تو ان کا ذاتی سامان سو اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، اور ان کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ایک لباس جو پہنتے تھے پھر نہیں پہنتے تھے۔ صبح کو ان کا لباس اور ہوتا تھا اور شام کو اور ہوتا تھا اور سواریاں ان کی منتخب ہوتی تھیں۔ ان کو بطور مثال کے ذکر کیا جاتا تھا کہ فلاں آدمی تعیش اور عیش وعشرت میں عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا ہے۔ ان کی گورنری کے زمانے میں بڑی پر تعیش ، بڑی سہولتوں والی اور آرام دہ زندگی تھی جیسے شہزادوں کی ہوتی ہے۔ جب تاریخ پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ کتنی سہولت اور تعیش کی زندگی تھی۔ لیکن جب آپؒ امیرالمومنین بنے تو اس کے بعد انہوں نے سب سے پہلا کام کیا کیا؟

درمیان میں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک دوست حیوہ بن شریحؒ تھے جو بڑے محدثین میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا ایک خواب سنایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور حضرات شیخین حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تشریف فرما ہیں اور آپ بھی سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جناب نبی کریمؐ حضرات شیخین کی طرف اشارہ کر کے آپ کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ اے عمر! اگر تمہیں حکومت ملے تو ان جیسی حکومت کرنا۔

یہ خواب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذہن میں تھا، تو خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ جب باہر نکلے تو عمدہ گھوڑوں کا ایک دستہ ان کی سواری کے لیے حاضر تھا۔ آپ نے سارا دستہ واپس کر دیا۔ ان کی ایک ذاتی خچر تھی، فرمایا میری سواری کے لیے یہ کافی ہے۔ یہ سب گھوڑے واپس کر دو، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ خلیفہ بننے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ گھوڑے واپس کر دیے۔

اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اصلاحات میں یہ بات ہے کہ آپ نے باغِ فدک بیت المال کو واپس کیا۔ امام سیوطیؒ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں لکھا ہے کہ بیت المال کے اسی فیصد اثاثے شاہی خاندان کے لوگوں کے قبضے میں تھے۔ باغِ فدک جو ہمارے ہاں بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ کا عنوان ہے، اور ہمارے اور اہلِ تشیع کے درمیان مناظرے کا بہت بڑا موضوع ہے۔ شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ باغ حضرت فاطمہؓ کو ملنا چاہیے تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انکار کیا تھا، پھر حضرت عمرؓ نے بھی انکار کر دیا تھا۔ اہلِ تشیع کا موقف یہ ہے کہ یہ باغ حضور نبی کریمؐ کی وراثت تھی اور نعوذ باللہ ان خلفاء نے وراثت غصب کر لی اور حضرت فاطمہؓ کو وراثت نہیں دی۔ جبکہ اہلِ سنت کا موقف یہ ہے جس کی

وضاحت پوری تفصیل کے ساتھ حضرت عمرؓ بن خطاب نے کی جو کہ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ حضور نبی کریمؐ کی وراثت تقسیم نہیں ہوئی، آپؐ کی ملکیت میں جتنا مال تھا وہ وقف تھا، بیت المال کا تھا۔ اس باغ سے اہلِ بیت اور خاندانِ نبوت کے اخراجات پورے ہوتے تھے، لیکن وہ ان کی ملکیت نہیں تھا۔ اس بنیاد پر فدک کا باغ بیت المال کی مِلک میں رہا، نہ وہ حضرت علیؓ کو ملا اور نہ حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کو ملا۔ حتیٰ کہ جب حضرت علیؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے بھی باغِ فدک بیت المال ہی کی مِلک میں رکھا اور اس کی ملکیت منتقل نہیں کی۔

لیکن بعد میں جب بنوامیہ کی حکومت آئی تو وہ باغِ فدک بھی لوگوں کے تصرف میں آگیا۔ جب بیت المال کے اثاثے لوگوں کے تصرف میں گئے تو فدک کا باغ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مل گیا۔ گورنری کے پورے زمانے میں ان کی مِلک اور تصرف میں رہا۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ اعلان کیا کہ میں پہلا حکم یہ جاری کر رہا ہوں کہ فدک کا باغ جو میری مِلک میں ہے، جو مجھے دیا گیا ہے وہ میرا نہیں ہے بلکہ بیت المال کا ہے۔ اور یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ جس فدک کے باغ پر سیدہ فاطمہؓ کا حق تسلیم نہیں کیا گیا، وہ میرا کیسے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا میں وہ واپس کر رہا ہوں۔ چنانچہ آپؒ نے باغِ فدک بیت المال کے منتظم کے حوالے کر دیا کہ آج کے بعد اس باغ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے پہلے گھوڑے واپس کیے، باغ فدک واپس کیا، پھر گھر کا بہت سا سامان بھی بیت المال میں واپس کیا۔

یہ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ میں علماء کرام سے، بالخصوص جو علماء اور کارکن نظامِ اسلام کے نفاذ کی جدوجہد میں کسی بھی درجے میں شریک ہیں، ان سے کہا کرتا ہوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی، ان کے طرزِ حکومت اور ان کی اصلاحات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں، اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کہاں کہاں خرابیاں ہیں؟ ہم نے کہاں کس کس بات کی اصلاح کرنی ہے اور کیسے کرنی ہے؟ اس موضوع پر ویسے تو ماضی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، بڑی تفصیلات حدیث اور تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن اگر اس پر تازہ ترین کتاب دیکھنا چاہیں تو حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی اردو میں مختصر ترین جامع کتاب ہے اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ جس عالم یا رہنما یا کارکن کا نفاذِ اسلام کی جدوجہد سے تعلق ہے اس کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی، ان کے طرزِ حکومت اور ان کی اصلاحات کا مطالعہ کرنا میرے نزدیک فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے، اس کے بغیر وہ نہیں سمجھ پائے گا کہ اسلام کا نظام

کیا ہے، کہاں کہاں خرابیاں ہیں اور وہ خرابیاں کیسے دور ہو سکتی ہیں۔ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ اصلیہ کا مزاج اس کے بغیر سمجھ نہیں آئے گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک تھیں، جن کے باپ امیر المومنین تھے، بھائی بھی امیر المومنین بنے، دوسرے بھائی بھی امیر المومنین بنے۔ ان کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک افواج کے سپریم کمانڈر تھے۔ یہ بادشاہوں کی بہن، بادشاہ کی بیٹی اور امیر المومنین کی اہلیہ ہیں، یعنی اتنے ناز نخروں میں پلی ہوئی شہزادی اور ملکہ تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت سنبھالنے کے بعد جب گھر تشریف لائے تو ان سے کہا کہ فاطمہ! دیکھو مجھے خلیفہ بنا دیا گیا ہے، اب مسلمانوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے، میں اس کا مسئول ہوں، تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے پاس جو بھی مال و دولت ہے یہ چونکہ ہمارا ذاتی نہیں تھا ہمیں بیت المال سے دیا گیا تھا، ہمارے پیشرو لوگوں نے کسی کو کچھ دے دیا کسی کو کچھ دے دیا، اس لیے میں فدک واپس کر کے آیا ہوں۔ تمہارے پاس جواہرات، زیور اور سونا چاندی جو کچھ ہے اور تم جانتی ہو کہ یہ تمہارا نہیں ہے، تمہارے باپ نے بیت المال سے تمہیں دیا تھا، لہٰذا یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ تو نہیں کہتا کہ واپس کر دو لیکن یہ کہتا ہوں کہ اس گھر میں یا یہ رہیں گے یا میں رہوں گا۔ اگر میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو یہ چیزیں واپس کرنی ہوں گی، اور اگر یہ چیزیں رکھنی ہیں تو رکھو میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اہلیہ کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔ وہ اچھا زمانہ تھا۔ میں کہا کرتا ہوں آج کا زمانہ ہوتا تو اتنے ناز و نخروں میں پلی ہوئی شہزادی کہتی جناب! آپ تشریف لے جائیں، یہ جو کچھ ہے میرا ہے، مجھے میرے والد نے دیا تھا۔ لیکن حضرت فاطمہؒ نے کیا خوبصورت جواب دیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں۔ انہوں نے کہا حضرت! میرا زیور بھی آپ ہیں، میرا لباس بھی آپ ہیں، مجھے آپ کے سوا کچھ نہیں چاہیے، اس گھر میں آپ کو جو کچھ بھی نظر آتا ہے کہ بیت المال کی مِلک ہے، ہماری مِلک نہیں ہے، تو اسے آپ بیت المال میں واپس کر دیجئے۔ آپ فاطمہ کی پیشانی پر شکن نہیں دیکھیں گے، فاطمہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بیوی کے زیورات، جواہرات کچھ بھی ان کے باپ نے انہیں دیا تھا وہ سب واپس کر دیا اور بیت المال میں جمع کروا دیا۔

یہیں پر بس نہیں کیا، اس کے بعد تیسرا مرحلہ آیا۔ امام سیوطیؒ نے بڑی تفصیل سے واقعہ بیان کیا ہے

کہ تیسرے مرحلے پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بنوامیہ کے شاہی خاندان کی میٹنگ بلالی اور کہا کہ اس وقت تمہارے پاس جو باغات اور محلّات ہیں یہ بیت المال کے ہیں، تمہارے نہیں ہیں، یہ بات تم بھی جانتے ہو میں بھی جانتا ہوں، لیکن ہم مقتدر اور حکمران لوگ ہیں تو ہم نے اپنے استعمال کے لیے یہ چیزیں گھر میں رکھی ہوئی ہیں، میں نے تو اپنے اثاثے بیت المال میں واپس کر دیے ہیں، آپ لوگ بھی اپنی خوشی سے واپس کر دیں تو اچھی بات ہے، ورنہ میں واپس لوں گا۔ میں امیر المومنین ہوں میرے پاس اتھارٹی اور اختیارات ہیں، لیکن میں بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں جس طرح میں نے بیت المال کی ساری چیزیں واپس کی ہیں آپ بھی واپس کر دیں۔ یہ بات سن کر سب لوگ پریشان ہو گئے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بیت المال کے اثاثے واپس لینے کے لیے لوگوں پر دباؤ ڈالا تو بنوامیہ کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ اب یہ امیر بنا ہے تو ہمیں بیت المال سے نہ دے لیکن پہلوں کے دیے ہوئے کیوں واپس کر رہا ہے۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا موقف تھا کہ میں تو بیت المال کی ہر چیز واپس لوں گا۔ اس کے لیے آپریشن کرنا پڑا تو کروں گا کہ بیت المال کی ہر چیز واپس آنی چاہیے، یا خلافت چھوڑ دوں گا۔

اس دوران ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ تفصیل سے اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آپ کی سمجھ میں آئے کہ اسلام کا نظام کیا ہے؟ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان تھیں۔ اس خاندان میں سب سے بزرگ شخصیت اس وقت یہی تھیں، معمر سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب یہ اعلان کیا کہ تمام شاہی خاندان اپنے تمام اثاثے واپس کریں، پندرہ دن کی مہلت ہے، اس کے اندر اندر واپس کر دو، ورنہ میں لے لوں گا، مجھے اس کا طریقہ آتا ہے، تو اس خاندان کے لوگ مل کر ان کی پھوپھی کے پاس گئے اور جا کر ان سے کہا کہ دیکھیں عمر ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے، وہ ہم سے سب کچھ چھینتا جا رہا ہے، اس کو منع کریں۔ تو فاطمہؒ نے بڑی دلچسپ مزے کی بات کی، کہا کہ جب تم اس کے باپ کا رشتہ کر رہے تھے تو میں نے مخالفت کی تھی کہ وہاں رشتہ نہ کرو۔ حضرت عبدالعزیزؒ کا رشتہ حضرت عمرؓ بن خطاب کی پوتی سے ہوا تھا۔ فاطمہ کہتی ہیں جب حضرت عمرؓ کی پوتی تم گھر میں لا رہے تھے تو میں نے مخالفت کی تھی کہ یہ جوڑ تم سے ہضم نہیں ہو گا، اس وقت تم نے میری بات نہیں سنی تھی تو اب بھگتو، میں کیا کر سکتی ہوں؟ یہ حضرت عمر بن خطابؓ کی پوتی کا بیٹا ہے، یہ وہی کرے گا جو حضرت عمرؓ کرتے تھے۔

اس کے بعد پھوپھی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو بلا کر کہا بیٹا! تم کیا کر رہے ہو؟ اب تم امیر بنے ہو تو تمہارا اختیار ہے لوگوں کو نہ دو، لیکن تم سے پہلے امراء جو کچھ لوگوں کو دے کر گئے ہیں اس میں کیوں مداخلت کر رہے ہو؟ اپنے دور کے فیصلے کرو، پچھلے دور کے فیصلوں کو کیوں منسوخ کر رہے ہو؟ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بڑا خوبصورت جواب دیا کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی بزرگ فوت ہو جائیں، ان کی وراثت غلط تقسیم ہوئی ہو، اور آپ کے علم میں ہو کہ یہ وراثت غلط تقسیم ہوئی ہے، تو کیا آپ کو مداخلت کا حق ہے یا نہیں ہے؟ قرآن مجید میں ہے فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینھم فلا اثم علیہ قرآن مجید کی منشا یہ ہے کہ مرنے والا اگر غلط وصیت کر گیا ہے تو بعد میں جو ذمہ دار ہے وہ وصیت کو نافذ نہیں کرے گا بلکہ وصیت میں اصلاح کرے گا۔ مجھ سے پہلے جو غلط فیصلے ہوئے ہیں مجھے قرآن مجید حق دیتا ہے کہ میں ان کی اصلاح کروں۔ پھوپھی جان! میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ غلط فیصلوں کی اصلاح کر رہا ہوں اور جو اموال غلط تقسیم ہوئے ہیں وہ واپس لے رہا ہوں۔ جب تک میرے اختیارات نہیں تھے میری ذمہ داری نہیں تھی تو میں بھی ساتھ چل رہا تھا، لیکن اب یہ میری ذمہ داری ہے اور وہ چیز جو غلط ہے میں اس کو صحیح کروں گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ان اصلاحات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں خلافت کے مزاج میں کیا فرق آ گیا تھا، جس فرق کو ختم کرنے کی کوشش حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کی تھی۔ آپ نے جس کے پاس بھی بیت المال کی دولت تھی، وہ بڑی حکمت سے واپس لی۔ کہا جاتا ہے کہ تین مہینے لگے تھے کہ بیت المال کی ہر چیز واپس آ گئی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں بھی یہ بحث چلی تھی اور جسٹس افتخار محمد چوہدری نے مہم چلائی تھی کہ قومی اثاثے واپس لانے ہیں۔ ہمارے قومی خزانے کی رقوم بڑے لوگوں کے قبضے میں ہیں اور باہر کے بینکوں میں جمع ہیں، یہ بات امر واقعہ ہے۔ ایک مغربی ماہر معیشت کا تجزیہ ہے کہ پاکستان کی سرکاری اور قومی دولت جو باہر کے بینکوں میں جمع ہے، اگر وہ واپس آ جائے تو پاکستان میں تیس سال تک کسی قسم کا ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، بغیر ٹیکس کے ملک کا نظام چلے گا، اور تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہوں گی۔ جسٹس افتخار چوہدری نے یہ مہم شروع کی کہ قومی اثاثے اور سرکاری خزانے جن لوگوں نے قبضہ کر رکھے ہیں واپس لائیں، تو میں نے اس پر کالم لکھا تھا اور ان کو خط بھی لکھا تھا کہ قومی اثاثے اور سرکاری خزانے واپس آ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے عمر بن عبدالعزیزؒ بننے کی ضرورت

ہے کہ پہلے اپنے گھر سے واپس کرو، پھر دوسروں سے مانگو، اور پھر اس بات پر اڑ جاؤ کہ ہر ایک سے واپس لینے ہیں۔ وہ اثاثے واپس آ سکتے ہیں کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن اس کے لیے ایک عمر بن عبدالعزیز چاہیے، اللہ کرے کہ ہمیں کہیں سے میسر آ جائے۔

لطیفے کی بات ذکر کرتا ہوں ہمارے ہاں عام طور پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کا بہت حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک سیاستدان نے ایک دفعہ بیان دیا کہ ہمیں پاکستان میں اسلام تو چاہیے لیکن مولویوں والا نہیں، حضرت عمرؓ والا اسلام چاہیے۔ تو میں نے اس پر کالم لکھا کہ مہربانی کرو، حضرت عمرؓ والا اسلام ہم سے ہضم نہیں ہوگا، کوئی ڈھیلی ڈالی بات کرو، اورنگزیب، سلطان شمس الدین التمش طرز کے لوگوں کی بات کرو۔ حضرت عمرؓ آئیں گے تو ان کے ہاتھ میں کوڑا ہوگا جس سے نہ تو بچے گا اور نہ میں بچوں گا۔ ہم سے تو چھوٹا سا عمر یعنی افغانستان کے ملّا محمد عمر بھی ہضم نہیں ہوا، تم اتنے بڑے عمرؓ کی بات کرتے ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حوالے سے یہ بات بھی کرنا چاہتا ہوں کہ جب بادشاہ اس معیار پر آتا ہے تو رعیت کا کیا حال ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ خلافت میں عراق کے گورنر نے خط لکھا کہ حضرت! سالانہ بجٹ میں پیسے بچے ہوئے ہیں ان کا کیا کروں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکم بھیجا کہ مقروضوں کے قرضے ادا کر دو۔ اس نے کہا، کر چکا ہوں۔ پھر حکم بھیجا، کنواروں کی شادیاں کروا دو۔ اس نے کہا، کروا چکا ہوں۔ پھر تیسرا حکم بھیجا، خاوندوں کے مہر ادا کر دو۔ اس نے کہا، یہ بھی کر چکا ہوں۔ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چوتھا حکم یہ بھیجا کہ کسانوں کو آسان قسطوں پر قرضے دو تاکہ وہ اپنی زمینیں آباد کریں۔ جب حکمران ایک دائرے میں آتا ہے تو رعیت کا یہ حال ہوتا ہے۔ فارسی کا محاورہ ہے ”لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم“۔

میں بڑے حضرت عمرؓ کی بات نہیں کرتا وہ تو بہت بڑے ہیں، میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بات کرتا ہوں۔ حکمرانوں کے لیے آج کے دور میں اصلاحات کے لیے، نفاذِ اسلام اور شریعت کی بالادستی کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آئیڈیل ہیں۔ ہمیں آئیڈیل بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ تبدیلی کیسے ہوگی۔ میں اپنے سارے معاملات پر بھی چلتا رہوں اور شریعت بھی آ جائے ایسا تو نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں کوئی معیار بنانا پڑے گا کہ ہمیں یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا۔

بنو امیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور بڑا شاندار دور تھا۔ انہوں نے اڑھائی سال

خلافت کی۔ پھر اسی خاندان نے زہر دے کر ان کو شہید کروا دیا۔ یہ تاریخ کے المیے اور بڑے ستم کی باتیں ہیں لیکن برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے جانشین ولید نے ان کی تدفین کے بعد جب خلافت سنبھالی تو پہلا آرڈر یہ جاری کیا کہ مجھ سے پہلے جو حکمران آیا تھا وہ بڑا سادہ اور مجنون تھا، میں اس کے تمام آرڈر منسوخ کرتا ہوں اور سابقہ پوزیشن پر واپس جا رہا ہوں، یوں خلافت کے مختلف معیارات چلتے رہے۔

خلافت کا رِفاہی تصور اور نظم

ریاست اور رفاہی ریاست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کسی بھی ملک کی حکومت اور ریاست کے چار پانچ بنیادی کام سمجھے جاتے ہیں:

- سرحدوں کی حفاظت
- ملک میں امن قائم کرنا
- لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنا
- انصاف فراہم کرنا
- اور لوگوں کو زندگی کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ فراہم کرنا۔

یعنی کسی ریاست کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کرے تاکہ کوئی باہر سے حملہ نہ کرے، ملک کے اندر امن ہو بدامنی نہ ہو، ظلم و زیادتی اور فساد نہ ہو، لوگ ایک دوسرے پر ظلم زیادتی کریں تو مظلوم کو انصاف فراہم کیا جائے، ظالم کو اس کے جرم کی سزا ملے جو کہ عدلیہ کا کام ہوتا ہے، ملک کی حدود میں رہنے والوں کو زندگی کی سہولیات آسانی سے فراہم ہوتی رہیں اور ان سہولیات کو حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ ریاست کا عام تصور ہے۔

ویلفیئر اسٹیٹ اور رفاہی ریاست کا دائرہ اس سے آگے ہے۔ ایک رفاہی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دیتی ہے۔ ایک ہے سہولیات فراہم کرنا کہ لوگوں کو کوئی چیز حاصل کرنے میں دِقت نہ ہو، اور ایک یہ ہے کہ حکومت خود ذمہ داری اٹھائے کہ یہ سہولیات ہم فراہم کریں گے۔ حکومت اور ریاست لوگوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دے اور ذمہ داری اٹھائے کہ ہم فراہم کریں گے، یہ رفاہی ریاست ہوتی ہے۔ دنیا میں آج متعدّد ویلفیئر اسٹیٹس موجود ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا تو قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے بھی اس کے لیے "اسلامی فلاحی ریاست" کی اصطلاح استعمال کی تھی، اللہ کرے کہ پاکستان ایسی ریاست بن جائے۔

رفاہی ریاست کا نقطۂ آغاز

رفاہی ریاست کیا ہوتی ہے ؟اس بارے میں اسلام کا نظام اور شریعت کا مزاج کیا ہے ؟اور رفاہی ریاست کی بنیاد کیا ہے ؟اس حوالے سے بخاری شریف کی روایت ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدا میں معمول مبارک یہ تھا کہ جب کوئی آدمی دنیا سے رخصت ہوجاتا،اس کے جنازے کا مرحلہ ہوتا توجنازہ پڑھانے سے پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوال کیاکرتے تھے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تونہیں ہے ؟جواب ملتاکہ نہیں ہے،توجنازہ پڑھادیتے۔اور اگر یہ بتایاجاتاکہ یہ مقروض فوت ہواہے توسوال کرتے کہ اس کے ترکہ میں قرضہ اداکرنے کی گنجائش موجود ہے ؟جواب ملتاکہ موجود ہے،توبھی جنازہ پڑھادیتے۔لیکن اگر یہ پتہ چلتاکہ مرنے والا مقروض فوت ہواہے اور اتناترکہ نہیں چھوڑاکہ اس کاقرض اداکیاجاسکے،توآپؐ فرماتے صلوا علی صاحبکم اپنے ساتھی کاجنازہ پڑھ لو،اور خود نبی اکرمؐ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔

ایک موقع پرایک جنازے کے لیے دریافت کیاتومعلوم ہواکہ یہ مقروض ہے اور اس کے ترکہ میں ادائیگی کابندوبست موجود نہیں ہے،توحضور صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے ہٹ گئے اور ساتھیوں سے کہاکہ اس کاجنازہ تم لوگ پڑھ لو۔ایک صحابیِ رسول حضرت ابوقتادہؓ نے عرض کیاکہ یارسول اللہ !ہمارے اس بھائی کواس سعادت سے محروم نہ کریں،اس کاقرضہ میرے ذمہ ہے میں اداکردوں گا۔اس پرنبی کریمؐ نے جنازہ پڑھادیااور اس کے بعداعلان فرمایاکہ من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلّا او ضیاعا فالیّ وعلیّ جوشخص مال ودولت چھوڑکرفوت ہوا،اس کامال اس کے وارثوں کوملے گا،اور جوشخص قرض کا بوجھ یابے سہارا افراد چھوڑکر مرا،وہ میرے پاس آئیں گے اور ان کی ذمہ داری مجھ پرہوگی۔یعنی معاشرے کے ضرورتمند بے سہارالوگوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت اور ذمہ داری ریاست پرہے۔

یہ آغاز ہے اس بات کاکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نادار،بے سہارا اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی ذمہ داری اپنے سرلینے کااعلان کیا۔رفاہی ریاست کانقطۂ آغاز جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کایہ ارشاد گرامی ہے فالیّ وعلیّ وہ میرے پاس آئیں گے اور مجھ پران کی ذمہ داری ہوگی۔

اس سے پہلے حکمرانوں،بادشاہوں اور سرداروں میں یہ ہوتا تھاکہ اپنی رعیت کہ لوگوں میں جو معذور ہوتے ان کی خدمت کرتے اور ان پرخرچ بھی کرتے تھے لیکن وہ فالیّ کے درجے میں ہوتی تھی۔وعلیّ مجھ پراس کی ذمہ داری ہے،میری معلومات کے مطابق پوری تاریخ انسانی میں یہ پہلا

اعلان تھا کہ جو بوجھ تلے دبا ہوا آدمی ہے، جو بے سہارا فرد ہے اور جو لاوارث خاندان یا بچے اور عورتیں ہیں وہ میرے ذمے ہیں۔ یہ علیؓ کا لفظ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بولا گیا کہ کسی ریاست کے حکمران نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہو کہ سوسائٹی اور معاشرے کے نادار افراد میرے ذمے ہیں۔ اس لیے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ایک رفاہی ریاست یا ویلفیئر سٹیٹ کا نقطۂ آغاز کہا کرتا ہوں کہ یہاں سے ایک رفاہی ریاست کا آغاز ہوا۔

بیت المال اور اس کی آمدنی و مصارف

پھر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر یہ معمول رہا۔ آپ نے بیت المال کا نظم قائم کیا، جس کی آمدنی کے ذرائع معروف تھے زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ اور غنیمت وغیرہ۔ غنیمت میں سے بیت المال کو خمس ملتا تھا۔

بیت المال کے مصارف کیا تھے؟ جہاں اجتماعی ضروریات تھیں جہاد وغیرہ، وہاں یہ بھی تھا کہ معاشرے میں کوئی آدمی ضرورت مند ہے، کسی نے قرضہ دینا ہے اور ادائیگی کا بندوبست نہیں ہے، یا کوئی تاوان تلے دب گیا ہے اور وہ ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہے، تو وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپ بیت المال سے اس کا قرضہ ادا کرتے، اس کی ضرورت پوری فرماتے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان مبارک فرمایا کہ جو بوجھ تلے دبا ہوا آدمی ہے، جو بے سہارا فرد ہے اور جو لاوارث خاندان یا بچے اور عورتیں ہیں، وہ میرے ذمے ہیں۔ اور پھر آپؐ نے اس کا جو ماحول بنایا، اس کے حوالے سے دو تین واقعات عرض کرنا چاہوں گا۔ بیت المال کا تصور یہ قائم ہوا کہ جس کسی کو کسی حوالے سے کسی چیز کی ضرورت پڑی اور وہ چیز نہیں مل رہی تو وہ سیدھا حضورؐ کے پاس آتا تھا اور آپ کے ہاں سے اسے وہ چیز مل جاتی تھی۔

سفر کی سواری

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب سفر کر رہے تھے، راستے میں ان کا سواری کا اونٹ مر گیا، سفر لمبا تھا۔ ان صاحب کو پتا تھا کہ اب سواری کہاں سے ملے گی۔ وہ سیدھا مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں سفر پر جا رہا ہوں، سفر لمبا ہے اور سواری مر گئی ہے، لہٰذا مجھے سواری عنایت فرمائیں۔ حضورؐ اس وقت خوش طبعی کے موڈ میں تھے۔ ہم

یہ روایت عموماً دل لگی کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے لیکن ریاست کی ذمہ داری کے حوالے سے بیان نہیں کی جاتی۔ آنحضرتؐ خوش مزاج بزرگ تھے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ میں تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ آدمی سواری مانگ رہا ہے اور حضور فرمارہے ہیں کہ تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ پریشان ہوکر بیٹھ گیا کہ اونٹنی کے بچے کو میں کیا کروں گا، میں نے تو سفر کرنا ہے۔ اونٹنی کا بچہ مجھے اٹھائے گا یا میں اسے اٹھاؤں گا۔ وہ پریشان بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر عرض کیا تو حضورؐ نے فرمایا ٹھہرو تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ بیچارہ پھر پریشانی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ وہ جس کیفیت میں بیٹھا ہوگا آپ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں؟ تھوڑی دیر گزری کہ حضورؐ نے بیت المال سے یا کہیں سے اونٹ منگوایا اور اس کی مہار اس آدمی کو پکڑائی اور فرمایا یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔

جو بات میں نے عرض کی وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی سواری ختم ہوگئی اور سفر پر جانا ہے، تو اسے یہ پتا ہے کہ سواری کہاں سے ملے گی، اور پھر اسے آپؐ کے ہاں سے سواری مل گئی۔ یہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس کا عملی کا ماحول بنایا۔

بخاری شریف میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ذکر کرتے ہیں ہم نے کسی سفر میں جانا تھا غالباً جہاد کا سفر تھا۔ تو ہم چند اشعریوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ جناب نبی کریمؐ سے سواری مانگتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر عرض کیا یارسول اللہ! ہم نے سفر پر جانا ہے ہمارے پاس سواریاں نہیں ہیں تو ہمیں دو چار اونٹ دے دیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت اندازہ نہیں ہوسکا کہ حضورؐ کسی وجہ سے غصے میں بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے اس وقت سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے مجلس کی کیفیت نہیں دیکھی اور سوال کر دیا۔ جناب نبی کریمؐ چونکہ کسی اور وجہ سے ناراضگی کی کیفیت میں تھے اس لیے فرمایا جاؤ کوئی اونٹ نہیں ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے ایک اور غلطی ہوئی کہ میں نے دوبارہ سوال کر دیا۔ اس پر حضور نبی کریمؐ نے قسم اٹھالی واللہ لا احملکم خدا کی قسم! میں تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں میں بہت پریشان ہوا کہ یہ کیا ہوا، میں نے موقع محل نہیں دیکھا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی اور حضورؐ نے غصے میں قسم اٹھالی۔

حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں میں واپس چلا گیا، اپنے ساتھیوں کو جاکر بتایا کہ سواری نہیں ملی اور حضور نبی کریمؐ نے قسم بھی اٹھالی ہے کہ تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اپنے ساتھیوں

سے یہ بات کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کوئی آدمی آیا اور اس نے کہا ابو موسیٰ! رسول اللہ تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو تا کہ تمہیں پتہ چلے کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ جا کر حضورؐ سے پوچھ لو کہ کیا بات ہوئی تھی۔ جب ہم لوگ حضور نبی کریمؐ کی خدمت میں پہنچے تو وہاں اونٹوں کی دو جوڑیاں کھڑی تھیں، چار اونٹ تھے، آپؐ نے مجھے فرمایا کہ یہ لے جاؤ۔

حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ تیسری غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ اونٹ مل رہے تھے تو میں نے ان کی رسیاں پکڑیں اور گھر کو چل پڑا، راستے میں جا کر میرے ساتھیوں نے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ جناب نبی کریمؐ نے تو قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا اور آپؐ نے یہ چار سواریاں دے دی ہیں۔ تم نے حضورؐ سے قسم کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں کہ قسم کا کیا ہوا؟ ویسے ہی سواریاں لے کر آ گئے ہو۔ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خدشہ ہوا کہ اس کیفیت میں اگر ہم اونٹ لے کر جا رہے ہیں تو ان میں ہمارے لیے کوئی خیر کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے ہم واپس حضور نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور آپ نے قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہیں سواری نہیں دوں گا، لیکن پھر آپ نے ہمیں بلا کر سواریاں دے دیں، تو قسم کا کیا بنا؟ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم آئے تھے اس وقت میرے پاس سواری نہیں تھی، میں نے یہ اونٹ قیس بن سعد بن عبادہؓ سے تمہیں دینے کے لیے ادھار منگوائے ہیں۔ اور میں نے جو قسم اٹھائی تھی، مجھے خیال آیا کہ یہ قسم خیر کے کام میں رکاوٹ ہے، اور میرا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قسم اٹھا لوں کہ جس کو پورا کرنے میں خیر کا کوئی کام رکتا ہو تو میں قسم توڑ دیتا ہوں، قسم کو کسی خیر کے کام میں رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ میں نے قسم توڑ دی ہے، میں اس کا کفارہ دے دوں گا اور تمہیں یہ اونٹ دے رہا ہوں۔

کفارہ کی ادائیگی

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، میں روزے میں بیوی کے پاس چلا گیا ہوں، تو اس کا کیا کفارہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا، مسلسل ساٹھ روزے رکھ لو۔ اس نے کہا، میں نہیں رکھ سکتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ اس نے کہا، میرے پاس اس کی گنجائش نہیں ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا، بیٹھو تمہارے لیے کچھ بندوبست کرتے ہیں۔ روایت میں آتا ہے کہ اتنے میں دو ٹوکرے

کھجوروں کے آئے تو نبی کریمؐ نے اس کو دے دیے کہ جا کر اپنا کفارہ ادا کرو۔ غلطی اس کی ہے، کفارہ اس پر ہے، لیکن بیت المال سے ادا کیا جا رہا ہے۔

اس روایت کا اگلا حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! ہم سے زیادہ فقیر مدینے میں کون ہے جس کو دیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ خود ہی کھا لو۔ بہر حال اس پر تاوان پڑ گیا اس کی غلطی کی وجہ سے اور اس کے پاس تاوان ادا کرنے کا بندوبست نہیں تھا تو وہ تاوان بیت المال سے ادا ہوا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت المال کا ایک مصرف یہ بھی تھا کہ جو کوئی مشکل میں پھنس جاتا تھا تو اس کا تاوان حضور نبی کریمؐ بیت المال سے ادا کرتے تھے۔

دیت کی ادائیگی

یہ واقعہ بھی بخاری شریف میں مذکور ہے کہ یہودیوں کے علاقے میں ایک انصاری صحابیؓ کی لاش ملی جسے شہید کر دیا گیا تھا لیکن قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ نبی اکرمؐ نے مقتول کے وارثوں سے پوچھا کہ تم کسے ملزم ٹھہراتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو کچھ معلوم نہیں ہے، البتہ چونکہ یہودیوں کے علاقہ میں واقعہ ہوا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ہی کیا ہوگا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ان سے قسامہ (پچاس افراد کا حلف) لیا جائے گا، یعنی علاقہ کے پچاس منتخب افراد قسم اٹھائیں گے کہ نہ انہوں نے قتل کیا ہے اور نہ ہی انہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے، اور اس حلف کے بعد وہ اس کیس سے بری ہو جائیں گے۔ مقتول کے وارثوں نے کہا کہ وہ تو یہودی ہیں آسانی سے قسم اٹھا لیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ اس کے سوا تو اور کچھ نہیں ہو سکتا، البتہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قتل کو رائیگاں نہیں جانے دیا بلکہ مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کی۔

عید الاضحیٰ کی قربانی

بخاری شریف میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ معروف صحابی حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ سے دو تین دن پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بیت المال سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا۔ چالیس پچاس بکریاں ہوں گی اور فرمایا کہ ابھی دو تین دن بعد قربانی والی عید آ رہی ہے، یہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دو تاکہ ان کی قربانی کر لیں۔ حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے وہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دیں تو ایک بکری کا بچہ بچ گیا۔ میں نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول

اللہ! میں نے بکریاں تقسیم کر دی ہیں اور میرے حصے میں یہ بکری کا بچہ بچا ہے، جس کی عمر پوری نہیں ہے تو کیا میں اس کی قربانی کر لوں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں تم کر لو۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قربانی تو لوگوں پر واجب تھی مگر بکریاں بیت المال دے رہا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فالیؔ و علیؔ کا یہ ماحول بنایا کہ جس کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہو رہی تو وہ بیت المال پوری کرے گا۔ حضورؐ نے ریاست کے شہریوں کی ذمہ داری اٹھائی اور ذمہ داری پوری کرنے کا ماحول بھی بنایا۔ یہی ماحول آگے چل کر بیت المال کا نظام بنا، اور وہی بیت المال کا ماحول آگے چل کر رفاہی ریاست کی صورت میں سامنے آیا۔ اس پر آپ کو بیسیوں مثالیں ملیں گی۔ میں نے چند ایک واقعات اس لیے عرض کیے ہیں تاکہ بیت المال کا مصرف سمجھ میں آئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بیت المال قائم کیا تھا اس کے مصارف کیا تھے؟ کن کن لوگوں کو کس کس حوالے سے فائدہ پہنچتا تھا۔ سوسائٹی کے نادار و بے سہارا اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ بیت المال کا مصرف تھا۔ جناب نبی کریمؐ بیت المال سے اپنی صوابدید کے مطابق لوگوں کو وظیفے بھی دیتے تھے، ضرورت مندوں کو سواریاں بھی دیتے تھے، غلہ اور کھجوریں بھی دیتے تھے، اور ان کے قرضے اور دیتیں بھی ادا کرتے تھے۔

رفاہی ریاست کا نظم

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ویلفیئر سٹیٹ اور بیت المال کا ماحول پیدا کر دیا تھا اس کو عملی شکل حضرات خلفائے راشدینؓ نے دی ہے۔ حضور نبی کریمؐ کے زمانے میں تو یہ نظام چلتا رہا۔ لیکن جب حضرت صدیق اکبرؓ نے خلافت سنبھالی تو معاشی حوالے سے انہیں سب سے پہلے دو مسئلے پیش آئے۔ یوں سمجھ لیں کہ خلافت راشدہ کی شوریٰ کے ایجنڈے میں دو بنیادی باتیں تھیں جن پر اس زمانے میں فیصلے ہوئے۔

خلیفۂ وقت کے روزگار کا معاملہ

پہلی بات یہ تھی کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا اپنا کپڑے کا کاروبار تھا، کھڈیاں تھیں، آپ کپڑا بنتے تھے اور بازار میں لے جا کر بیچتے تھے۔ جب آپ نے خلافت کا منصب سنبھالا تو اگلے دن اپنی گٹھڑی اٹھائی اور بازار میں بیچنے چل دیے۔ حضرت عمرؓ راستے میں ملے تو پوچھا، حضرت! کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت

صدیق اکبرؓ نے کہا اپنے کام پر جا رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ کام پر جائیں گے تو پیچھے ریاست کے معاملات کون نمٹائے گا؟ کسی وقت بھی کوئی مسئلہ پیش آسکتا ہے، کوئی وفد آسکتا ہے، کوئی تنازعہ آسکتا ہے جس کا فیصلہ کرنا ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اگر میں یہاں بیٹھوں گا تو بچوں کی روٹی میرے ذمہ ہے، میں وہ کہاں سے پوری کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا آپ تشریف رکھیں، میں مشورہ کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اصحاب شوریٰ کو بلایا کہ اگر خلیفۂ وقت اپنے کام پر جائیں گے تو پیچھے ریاست کے معاملات کون نمٹائے گا؟ حکمرانی تو ہمہ وقتی کام ہوتا ہے، جزوقتی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ حاکم بارہ گھنٹے ڈیوٹی نہیں دیتا بلکہ اسے چوبیس گھنٹے اسٹینڈ بائی رہنا پڑتا ہے۔

چنانچہ اس پر مشورہ ہوا کہ سربراہِ ریاست جس نے سارے معاملات نمٹانے ہیں اور اپنا کام کاج نہیں کرسکتا، وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیا کرے گا؟ اس پر دو اصول طے ہوئے:

1. شوریٰ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تھے، انہوں نے یہ رائے پیش کی جس پر فیصلہ ہوا کہ جب یہ ریاست کا کام کریں گے، اپنا کام نہیں کرسکیں گے، تو ان کے اور ان کے بچوں کے اخراجات ریاست کے ذمے ہوں گے۔ یہاں سے فقہاء نے یہ اصول اخذ کیا کہ کوئی بھی آدمی جو کسی اجتماعی کام کے لیے وقف ہو جائے اور اپنا کام کاج نہ کرسکے تو اس کے تمام اخراجات اس متعلقہ ادارے کے ذمے ہیں۔ اس کے اخراجات اجتماعی سوسائٹی ادا کرے گی جن کا وہ کام کر رہا ہے۔
2. دوسرا یہ طے ہوا کہ حاکمِ وقت کے لیے معیشت کا معیار کیا ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کے معیارات تو مختلف ہوتے ہیں۔ اس پر بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رائے دی کہ ایک متوسط طبقے کا شہری جتنے خرچ سے اپنے گھر کے اخراجات باعزت طریقے سے چلا لیتا ہے، خلیفۃ المسلمین کا بھی اتنا ہی حق ہے۔ لا وکس فیھا ولا شطط اوپر کے طبقے کا یا نچلے طبقے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جسے ہم مین آف دی سٹریٹ کہتے ہیں۔ ایک عام شہری کا معیارِ زندگی سامنے رکھ کر وظیفہ طے کیا جائے گا۔ حضرت علیؓ کی رائے کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ کا وظیفہ اس اصول پر طے ہوا۔ چنانچہ آپ زندگی بھر وہ وظیفہ لیتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کی مجلس شوری کا یہ پہلا فیصلہ تھا۔

سرکاری اموال کی تقسیم پر حضرات شیخینؓ کا طرزِ عمل

اسی دوران دوسرا مرحلہ یہ پیش آگیا کہ بحرین سے سالانہ آمدنی آگئی۔ اس زمانے میں بحرین بہت امیر ریاست تھی۔ آج بھی بحرین امیر ترین ریاست ہے۔ اس وقت دنیا میں مہنگی ترین کرنسی کویت کے بعد بحرین کی ہے۔ پھر پونڈ اور یورو کا نمبر آتا ہے، ڈالر شاید پانچویں نمبر پر ہے۔ آج بھی بحرین کی کرنسی قوت کے اعتبار سے دنیا کی دوسری بڑی کرنسی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں بحرین سے جو سالانہ آمدنی وصول ہوئی زکوٰۃ، عشر اور جزیہ وغیرہ ریوینیو جب بیت المال میں آیا تو اسے لوگوں میں تقسیم کرنا تھا کہ بیت المال اپنے پاس ذخیرہ نہیں رکھے گا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اتھارٹی تھے۔ پیغمبر کو کسی اور سے دلیل لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس نے جو کہہ دیا وہی قانون ہوتا ہے۔ جیسے دنیا میں بادشاہ اتھارٹی ہوتا ہے اسی طرح دین میں پیغمبر ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑی اتھارٹی حضرت صدیق اکبرؓ پھر حضرت عمرؓ تھے، لیکن ان کو اپنے فیصلے میں دلیل دینی پڑتی تھی کہ قرآن یہ کہتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ پیغمبر کے سوا کوئی اور اتھارٹی ایسی نہیں ہے جو دلیل کے بغیر فیصلہ کر سکے۔ ہم جن ائمہ کے مقلد ہیں ان کو بھی دلیل دینی پڑتی ہے اور دلیل کی بنیاد پر ان کی بات مانی جاتی ہے۔

جب بحرین اور دوسری جگہوں سے مال آیا تو اس پر مشاورت ہوئی کہ عہدِ نبوی میں اموال آتے تھے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے چاہتے تقسیم فرماتے تھے، کسی کو اعتراض کا حق نہیں تھا۔ جناب نبی کریمؐ تو اپنی صوابدید پر تقسیم فرما دیتے تھے کسی کو تھوڑا دے دیا، کسی کو انکار کر دیا، کسی کو زیادہ دے دیا، وہ تو پیغمبر تھے، لیکن ہمیں کوئی ضابطہ اور اصول طے کرنا چاہیے۔ آپؐ کے بعد تو کوئی شخصی اتھارٹی نہیں تھی، اب دلیل کوئی قانون ہوگا۔ معاشرے اور سوسائٹی میں بیت المال اور سرکاری اموال سے وظائف کی تقسیم کا کوئی طے شدہ اصول ہوگا تو تقسیم ہوگی ورنہ جھگڑے ہوں گے۔ چنانچہ اس مشورے میں ہمارے سب سے بڑے دو بزرگوں حضرات شیخینؓ میں اختلاف رائے ہو گیا۔

- حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ بیت المال سے شہریوں کو وظیفے دینے کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اس کی دینی اور معاشرتی حیثیت کو دیکھا جائے گا اور فضیلت کی بنیاد پر تقسیم ہو۔ یعنی گریڈ سسٹم ہو۔ انہوں نے چھ سات گریڈ بتائے کہ سب سے زیادہ امہات المومنین کو دیں، پھر مہاجرین

السابقون کو، پھر انصار کو، پھر بدریوں کو، پھر اصحابِ شجرہ کو، پھر ان کو جو فتح مکہ پر مسلمان ہوئے۔ یعنی دینداری میں درجات کے لحاظ سے گریڈ سسٹم بنا دیا جائے اور اس حساب سے وظائف تقسیم کیے جائیں۔

- حضرت صدیق اکبرؓ نے اس رائے کو ماننے سے انکار فرما دیا، ان کی رائے سب کو برابر برابر دینے کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا بڑا مشہور جملہ ہے جو کہ امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں ذکر کیا ہے، فرمایا هذه معاش والاسوة فيه خير من الاثرة۔ یہ معیشت کا باب ہے اس میں برابری ترجیح سے بہتر ہے۔ دین کے اعتبار سے فضیلت آخرت سے تعلق رکھتی ہے، یہ حقوق اور دنیاوی معیشت کی بات ہے اس میں ترجیح کی بجائے برابری بہتر ہے، اس لیے میں برابر تقسیم کروں گا۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے برابر کی بنیاد پر تقسیم کی۔ معاشی مساوات کہ سرکاری وسائل میں سب کا حق برابر ہو، چنانچہ آپ اپنے اڑھائی سالہ دورِ خلافت میں اسی اصول پر سب مسلمانوں کو برابر حصہ دیتے رہے۔ جتنا امہات المومنین کو دیتے تھے وہی عام مسلمانوں کو دیتے تھے۔ جتنا بدریوں کو دیتے تھے وہی مؤلفۃ القلوب کو دیتے تھے۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو ان کی رائے چونکہ مختلف تھی تو انہوں نے اپنی رائے پر عمل کیا، کیونکہ اصول ہے کہ مجتہد اپنی رائے پر عمل کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے سارا نظام تبدیل کر دیا اور درجہ بندی کر کے گریڈ سسٹم بنا لیا۔ سات یا آٹھ گریڈ مقرر کیے۔ سب سے زیادہ امہات المومنین کو دیتے بارہ ہزار درہم سالانہ، پھر مہاجرین کو دس ہزار سالانہ، پھر آٹھ ہزار، پھر چھ ہزار، پھر چار ہزار۔ حضرت عمرؓ کو دس سال خلافت کا موقع ملا، اس میں آپ اسی اصول کے مطابق سالانہ وظائف تقسیم فرماتے رہے، باقاعدہ رجسٹر تھے اور فہرستیں بنی ہوئی تھیں۔

اس میں لطیفے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بیٹے حضرت حسینؓ اس تقسیم میں چار ہزار والے گریڈ میں آتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ احتراماً حضرت حسینؓ کو پانچ سو درہم زیادہ دیتے تھے۔ باقیوں کو چار ہزار اور ان کو ساڑھے چار ہزار دیتے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اشکال ہوا، ایک دن عرض کیا ابا جان! میں اور حسینؓ ایک گریڈ کے ہیں، ان کو آپ پانچ سو درہم زیادہ دیتے ہیں حالانکہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ بات سن کر غصے میں آ گئے

اور بیٹے سے ناراض ہوئے کہ تمہیں حسینؓ کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ کیسے ہوا؟ اور یہ جملہ فرمایا کہ حسینؓ کے نانا کو جانتے ہو؟ میں خلیفہ ہوں تو حسینؓ کے نانا کی وجہ سے ہوں، اور تم امیر المومنین کے بیٹے ہو تو حسینؓ کے نانا کی وجہ سے ہو، انہی کی برکت سے تو سب کچھ ملتا ہے، خبردار! آئندہ یہ بات نہیں کرنی۔

بہرحال حضرت عمرؓ نے گریڈ قائم کیے اور اس کے مطابق اموال تقسیم فرماتے رہے۔ امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں یہ تفصیل بیان کی ہے۔ ہمارے معیشت کے باب میں دو کلاسیکل بنیادی کتابیں امام ابو عبیدؒ کی "کتاب الاموال" اور امام ابو یوسفؒ کی "کتاب الخراج" ہیں، جن میں ہمارا پورا معاشی نظام موجود ہے جو کہ عہدِ بنو امیہ میں نافذ رہا ہے۔ یہ دونوں تیسری صدی کے بزرگ ہیں۔ یہ دونوں بنیادی کتابیں ہیں جو کہ بین الاقوامی سطح پر بھی پڑھائی جا رہی ہیں اور ہم بھی پڑھ پڑھا رہے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے دس سال گریڈ سسٹم پر تقسیم کی تو ایک دن فرمانے لگے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے ٹھیک تھی۔ گریڈ سسٹم سے سوسائٹی تقسیم ہوتی ہے اور طبقے بن جاتے ہیں۔ میں اس پر مثال دیا کرتا ہوں کہ اس بات کا مشاہدہ کرنا ہو تو اسلام آباد میں جا کر دیکھ لیں، رہائش کا انداز الگ الگ ہے، گفتگو کا انداز الگ الگ ہے، گریڈ سسٹم ہو تو مصافحہ بھی انگلیاں گن گن کر کرنا پڑتا ہے کہ کتنی انگلیوں سے کرنا ہے، کس سے بات کرنی ہے اور کس سے نہیں کرنی۔

میں ایک ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں کہ گریڈ سسٹم سے سوسائٹی کیسے تقسیم ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست وفاقی وزارتِ تعلیم میں سیکرٹری تھے، مجھے وزارت تعلیم میں کسی اور افسر سے کام تھا۔ تین چار دفعہ گیا مگر کام ہو نہیں رہا تھا تو میں نے اپنے دوست سے کہا کہ اُن سے کہہ دیں تو میرا کام ہو جائے گا۔ یہ انیسویں گریڈ کے افسر تھے اور وہ سترہویں گریڈ کا تھا۔ میں نے کہا فون کر دیں تو کہنے لگے کر دوں گا، لیکن فون نہیں کیا۔ میں نے دوسری دفعہ کہا تو کہنے لگے کر دوں گا، لیکن پھر بھی نہیں کیا۔ میں نے تیسری دفعہ کہا تو ان کا بیٹا بولا کہ انکل! یہ فون نہیں کریں گے کیونکہ وہ سترہویں گریڈ کا ہے اور یہ انیسویں گریڈ کے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے پاس جائیں اور اس کی اِن سے بات کروا دیں۔ فون وہ کرے، یہ فون نہیں کریں گے۔ میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا تب مجھے حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے سمجھ آئی کہ گریڈ سسٹم سے سوسائٹی کیسے تقسیم ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے ٹھیک تھی، اگلے سال میں سسٹم بدل دوں گا اور

حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے کے مطابق برابر تقسیم کروں گا۔ ان کا رجوع اور یہ اعلان کتاب الخراج میں موجود ہے۔ لیکن اگلے سال سے پہلے حضرت عمرؓ شہید ہوگئے۔ پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے، وہ بھی مجتہد تھے تو انہوں نے اسی رائے کو قائم رکھا۔ اجتہاد میں یہی ہوتا ہے کہ مجتہد جس رائے کو ترجیح دے اس پر چلتا ہے۔

برابری اور ترجیح کی تقسیم میں ریاست کی صوابدید

البتہ یہاں زیر بحث مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز کرنا شاید قرین انصاف نہ ہو۔ وہ یہ کہ صدیقی دور میں بیت المال سے وظائف کی تقسیم برابری کی بنیاد پر ہوتی رہی ہے، اور فاروقی دور میں ترجیح کا اصول اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ نے اس سے رجوع کا زبانی اظہار فرما دیا تھا لیکن اس کے بعد بھی ترجیحی اصول پر عملدرآمد کا تسلسل قائم رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دراصل دونوں اصول موقع محل کی مناسبت سے قابلِ عمل ہیں اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی اصول کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اصل بات اجتماعی مفاد کی ہے، اگر کسی وقت حالات کا تقاضا قومی ذرائع پیداوار کی برابری کی بنیاد پر تقسیم کا ہو اور اجتماعی مفاد اس میں ہو تو ایک اسلامی حکومت اس اصول کو اپنا سکتی ہے، اور کسی دور میں اگر اجتماعی حالات کا تقاضا اس کے برعکس ہو تو دوسری صورت اختیار کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ کیا آج پاکستان کے عمومی حالات کے تناظر میں گریڈ سسٹم ختم کر کے حضرت صدیق اکبرؓ کا اسوۂ قابلِ عمل نہیں ہے؟ یہ غور طلب پہلو ہے۔

میں نے یہ ذکر کیا ہے کہ سرکاری حکام کا وظیفہ کس معیار پر ہوگا اور لوگوں کو وظیفہ کیسے دینا ہے۔ یہ دو فیصلے خلافت راشدہ کی پہلی مجلس شوریٰ نے کیے تھے۔ الغرض حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں بھی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المال کا نظام اور اس کی درجہ بندی چلتی رہی۔

رفاہی ریاست کی ذمہ داری

بیت المال کا باقاعدہ نظم، اس کی درجہ بندی، اور اس کے حساب کتاب کا آغاز حضرت عمرؓ نے کیا۔ اس کو محدثین کرامؒ اولیاتِ عمرؓ میں شمار کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وہ کام شروع کیے جو پہلے نہیں ہو رہے تھے۔ امام سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں ہر بزرگ کی حیاتِ مبارکہ کے ذکر کے آخر میں اولیات کا ذکر کیا ہے۔ اولیاتِ ابوبکرؓ، اولیاتِ عمرؓ، اولیاتِ عثمانؓ، اولیاتِ علیؓ کہ وہ کام جن کا انہوں نے آغاز کیا۔

اس کو اولیات کہہ لیں یا ان کے اجتہادات کہہ لیں کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے جو نئے فیصلے کیے۔

اولیاتِ عمرؓ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے بیت المال کا باقاعدہ دفتر بنایا اور ریکارڈ بنایا، باقاعدہ درجہ بندی کی، ڈیوٹیاں مقرر کیں، اور ساری تفصیل طے کی کہ دوسرے مصارف جہاد، ترقیات اور دیگر کاموں کے ساتھ بیت المال کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ معاشرے میں نادار اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرے۔ حضرت عمرؓ کا مزاج اور ذوق تو بہت اعلیٰ تھا۔ تاریخ میں مختلف واقعات آتے ہیں۔ اس کی ایک دو جھلکیاں ذکر کرنا چاہوں گا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں رفاہی ریاست کے نظام اور بیت المال کی ترتیب کیا تھی۔

حضرت عمرؓ کا رات کا گشت

حضرت عمرؓ کے سوانح نگار یہ واقعہ لکھتے ہیں کہ ان کا معمول تھا کہ رات کے وقت دو تین گھنٹے مدینہ میں گشت کیا کرتے تھے اور لوگوں کے حالات معلوم کیا کرتے تھے۔ مدینہ اس زمانے میں بڑا شہر نہیں تھا، درمیانے درجے کا قصبہ سمجھ لیں۔ ایک رات حضرت عمرؓ گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی کہ بچے مسلسل روئے جا رہے ہیں۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا، ایک بڑھیا باہر نکلی۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ بچے اس لیے رو رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے، بھوک اور فاقہ ہے۔ میرا خاوند گھر میں نہیں ہے اور میرے پاس کھلانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی نظر پڑی کہ ہنڈیا چولہے پر چڑھی ہوئی ہے اور اس میں کچھ پک رہا ہے۔ فرمایا ہنڈیا میں کیا ہے؟ اس نے کہا اس میں صرف پانی ہے تاکہ بچے دیکھتے دیکھتے بہلتے بہلتے سو جائیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بی بی! امیر المومنین اسی شہر میں رہتے ہیں تم نے اطلاع کیوں نہیں دی کہ میرے گھر میں فاقہ ہے، کھانے کو کچھ نہیں ہے تاکہ تمہارے گھر میں کچھ بھیج دیتے؟ وہ حضرت عمرؓ کو پہچان نہیں رہی تھی کہ آپ کون ہیں، اس نے کہا بیٹا! یہ کام میرا نہیں ہے کہ میں امیر المومنین کو بتاؤں کہ میرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے، یہ کام امیر المومنین کا ہے اس کو پتا ہونا چاہیے کہ میری رعیت کے کس گھر میں کھانے کو ہے اور کس گھر میں نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے پھر کہا، بی بی! عمر ایک آدمی ہے، کس کس کا پتہ چلائے گا؟ تو بی بی نے کہا بیٹا! اگر عمر اپنی رعیت کے بھوکے گھروں کا پتہ نہیں چلا سکتا تو اسے یہ منصب خالی کر دینا چاہیے، کسی ایسے آدمی کے لیے جو اپنی رعیت کے بھوکوں کا پتہ چلا سکے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کی ذمہ داری کا یہ شعور اور یہ احساس لوگوں میں پیدا

کیا کہ سوسائٹی میں جو نادار اور ضرورتمند لوگ ہیں وہ بے سہارا نہیں ہیں، ان کی ذمہ داری ریاست اور حکومت پر ہے۔ جو لوگ کمانے کے قابل نہیں ہیں، جو بوجھ تلے دب گئے ہیں، جو بے سہارا ہیں، ان کے اخراجات پورے کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اسی پر حضرت عمرؓ کا ایک مشہور جملہ مؤرخین اکثر ذکر کرتے ہیں کہ اگر دریائے فرات پر کوئی کتا بھی بھوک یا پیاس سے مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے سوال ہوگا کہ تمہاری حکومت میں ایک کتا بھوک سے کیوں مرا ہے؟ آپ نے ایک جانور کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ بھوکا مر گیا تو مجھ سے سوال ہوگا۔ اسلامی شریعت اور اسلامی تاریخ کے تناظر میں بیت المال کی ذمہ داری کیا ہے، حضرت عمرؓ کا یہ تاریخی جملہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔

بوڑھے یہودی کا واقعہ

کتاب الاموال میں روایت ہے۔ حضرت عمرؓ ایک دن بازار میں جا رہے تھے، دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی بھیک مانگ رہا ہے۔ کبھی ایک دکان سے مانگتا، کبھی دوسری سے۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں یہ بابا کیوں مانگ رہا ہے۔ ہم نے جب سارا نظم کیا ہوا ہے، وظیفے بھی دیتے ہیں اور ضرورت کے وقت پیسے بھی دیتے ہیں تو یہ بزرگ مانگ کیوں رہا ہے؟ حضرت عمرؓ نے ساتھی کو بھیجا کہ جا کر پتا کرو یہ بابا کون ہے۔ وہ اسے بلا کر لائے۔ آپ نے اس سے پوچھا آپ کون ہیں؟ اس نے کہا میں یہودی ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ تمہیں بیت المال سے وظیفہ نہیں ملتا؟ اس نے کہا، ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، وہ تمہارے اخراجات کے لیے کافی نہیں ہوتا؟ اس نے کہا کافی ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر مانگ کیوں رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کمانے کے قابل نہیں ہوں۔ ہم غیر مسلموں نے سال کے بعد جزیہ بھی دینا ہوتا ہے، ویسے تو میرا گزارا ہو رہا ہے، لیکن جزیے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور سال بھی پورا ہو رہا ہے چند دن باقی ہیں۔ میں اس لیے مانگ رہا ہوں کہ کچھ آدمیوں سے مانگ کر جزیے کی رقم پوری کر لوں گا اور بیت المال کو جزیے کی رقم دے دوں گا۔

غیر مسلم یہودی شہری کا یہ جملہ حضرت عمرؓ نے سنا تو بڑے پریشان ہوئے۔ آپؓ نے ساتھیوں سے کہا دیکھو! یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ اس کی جوانی کی کمائی ہم کھائیں، جوانی میں محنت مزدوری کر کے ہمیں جزیہ دے اور وہ ہمارے استعمال میں آئے، اور بڑھاپے میں ہم اسے لوگوں کے دروازوں پر مانگنے کے لیے چھوڑ دیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کسی سے مت مانگو، صبح میرے پاس آنا میں تمہارا مسئلہ حل کر دوں گا۔ دوسرے دن حضرت عمرؓ نے شوریٰ بلا لی، اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ کل

میں نے ایک یہودی بوڑھے کو مانگتے دیکھا ہے، مجھے اچھا نہیں لگا کہ جوانی میں ہم ان سے جزیہ وصول کریں جو ہمارے استعمال میں آئے، اور بڑھاپے میں یہ بے بس لوگوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے پھریں۔ یہ بات درست نہیں ہے اس کا کوئی حل نکالو۔ مشورے کے بعد حضرت عمرؓ نے قانون تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ جو غیر مسلم کمانے کے قابل نہ رہے وہ جزیہ سے مستثنیٰ ہے۔

حضرت عمرؓ کے ویلفیئر سسٹم کا مزاج یہ تھا کہ ایک غیر مسلم بھی بھیک کیوں مانگے؟ ہم کس لیے ہیں، بیت المال کس لیے ہے؟ معاشرے میں ایک آدمی بھیک مانگنے پر کیوں مجبور ہو؟ چنانچہ عملاً ثابت کر دیا کہ اسلامی ریاست میں نادار، بے سہارا اور بوجھ تلے لوگ بیت المال کی ذمہ داری میں شامل ہیں اور حکمران اس کے مسئول ہیں، اس کا سب سے مثالی تصور حضرت عمرؓ نے پیش کیا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رفاہی ریاست کا تصور کیا ہے۔

بچوں کا وظیفہ

حضرت عمرؓ بیت المال سے بچوں کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ کی ذمہ داریوں اور ان کے اخراجات میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت عمرؓ بچے کے حوالے سے ماں باپ کو وظیفہ دیتے تھے کہ کام کاج تو وہی کیا کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضابطہ یہ تھا کہ بچہ جب تک دودھ پیتا ہے، تب تک وظیفہ نہیں ملے گا، دودھ چھوڑ کر دوسری خوراک کی ضرورت پڑتی تو وظیفہ ملتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ابتدا میں یہ قانون اور ضابطہ تھا، فہرستیں بنی ہوئی تھیں، لوگ آکر بچوں کا وظیفہ لے جاتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے الفاروق میں واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عمرؓ حسبِ معمول رات کو گشت کر رہے تھے۔ ایک گھر کے سامنے سے گزرے تو بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ نے سوچا کہ بچہ نیند سے اٹھا ہوگا رو رہا ہوگا۔ چنانچہ آپ گزر گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ وہاں سے گزر ہوا تو دیکھا کہ بچہ پھر رو رہا ہے۔ پھر خیال ہوا کہ بچے روتے رہتے ہیں، ویسے ہی رو رہا ہوگا۔ اتفاق سے تیسری بار ادھر سے گزرے تو بچہ پھر بھی رو رہا تھا۔ اب حضرت عمرؓ وہاں کھڑے ہو گئے کہ کوئی مسئلہ ہے تبھی بچہ مسلسل رو رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک صاحب باہر آئے، اس سے دریافت فرمایا بچہ کافی دیر سے کیوں رو رہا ہے؟ اس نے عرض کیا اس کی ماں اس کو دودھ نہیں پلا رہی، اس لیے رو رہا ہے۔ آپؓ نے پوچھا، ماں دودھ کیوں نہیں پلا رہی؟ اس نے عرض کیا کہ ماں اس کا

دودھ چھڑوانا چاہتی ہے کہ جب تک یہ دودھ پیتا رہے گا اس کا وظیفہ نہیں ملے گا۔ دودھ چھوڑے گا تو وظیفہ ملے گا، تو اس کا وظیفہ جاری کروانے کے لیے ماں اس کو دودھ نہیں پلا رہی تا کہ بچہ دودھ چھوڑ کر خارجی خوراک کھائے تو ہم حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کریں کہ اب یہ روٹی کھاتا ہے، اس کا وظیفہ جاری ہو جائے۔

حضرت عمرؓ کے ساتھ جو ساتھی تھے غالباً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ان کو مخاطب کر کے اپنے بارے میں فرمایا عمر! تم نے کتنے معصوم بچوں کو رلایا ہو گا۔ تیری وجہ سے کتنے معصوم بچوں کا دودھ چھڑایا گیا ہو گا۔ مائیں دودھ چھڑانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتی ہوں گی۔ حضرت عمرؓ نے اس گھر والے سے کہا کہ اس کی ماں کو کہو کہ اسے دودھ پلائے، صبح میرے پاس آنا آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ صبح آپ نے شوریٰ بلالی اور یہ مسئلہ سامنے رکھا کہ ہم بچے کا دودھ چھوڑنے دینے کے بعد وظیفہ دیتے ہیں، مائیں وظیفے کے لالچ میں وقت سے پہلے دودھ چھڑواتی ہیں، جس سے بچوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ نے قانون میں ترمیم کر دی اور فرمایا کہ آج کے بعد بچہ پیدا ہوتے ہی وظیفہ جاری کر دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ اس بنیاد پر بچوں کو وظیفہ دیتے کہ خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہوا ہے تو اخراجات میں اضافہ ہوا ہے، تو اس کا بوجھ بیت المال برداشت کرے گا۔ بلا امتیاز ہر شہری کے بچے لیے وظیفہ دیا جاتا۔ چاہے یہودی ہے، عیسائی ہے یا مسلمان۔ حضرت عمرؓ نے اس نظام کو عروج تک پہنچایا چنانچہ آج بھی دنیا کی تاریخ میں ویلفیئر اسٹیٹ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا دور اور ان کی رفاہی ریاست کا یہ نظام سب سے زیادہ آئیڈیل سمجھا جاتا ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاہی ریاست کا تصور اور ماحول دیا تھا، اسے حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں منظم کیا گیا، اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا پورا نظام مرتب ہوا۔ جس کی دوسری قومیں تو آج تک پیروی کر رہی ہیں لیکن ہمارے ہاں وہ نظام اب نہیں رہا۔ اس نظام کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس زمانے میں اس نظام کی نوعیت کیا تھی؟ اس پر مزید چند واقعات نقل کرتا ہوں کہ جب رفاہی ریاست بنی تو کیا تبدیلی آئی تھی، کیا فرق پڑا تھا، اور اس نظام کی برکت سے معاشرے کی صورتحال کیا ہو جاتی ہے اس نظام کی برکات کیا ہیں؟

اسلامی نظام کی برکات

جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو کس درجہ کی خوشحالی پیدا ہوتی ہے اور کیسے معاشرہ امن کا گہوارا بنتا

ہے۔

نبی کریمؐ کی پیشگوئی اور حضرت عدیؓ کا مشاہدہ

اس پر بخاری شریف کی روایت ہے، حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتمؓ راوی ہیں کہ مسجد نبوی میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہ کرامؓ کی مجلس لگی ہوئی تھی، میں بھی بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا، سلام عرض کر کے بیٹھ گیا اور کہا یارسول اللہ! میں جس علاقے سے آیا ہوں اس علاقے میں چوریاں اور ڈکیتیاں بہت ہوتی ہیں، قتل بہت ہوتے ہیں، جان، مال اور عزت محفوظ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر گزری کہ ایک اور شخص آیا اور سلام عرض کر کے کہنے لگا یارسول اللہ! میں جس علاقے سے آیا ہوں وہاں خشک سالی بہت ہے، کافی عرصہ سے بارش نہیں ہوئی، غلّہ نہیں ہے، کنویں گہرے ہو گئے ہیں، پانی خشک ہو گیا ہے، لوگوں پر بھوک طاری ہے، کھانے کو کچھ نہیں ملتا، فاقہ ہے، بہت برا حال ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آنے والوں سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ حضرت عدیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا، عدی! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ حیرہ اس دور میں ایک شہر تھا جو اَب کوفہ کا کوئی محلہ ہو گا۔ انہوں نے جواب دیا یارسول اللہ! حیرہ دیکھا تو نہیں البتہ سنا ہے کہ بڑا مشہور شہر اور بڑا بارونق علاقہ ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا، عدی! اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں لمبی عمر دی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک خاتون چلے گی، اونٹ کے کجاوے میں بیٹھی ہوئی، سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی، تنہا مکہ آئے گی۔ اور مکہ سے چلے گی، تنہا حیرہ جائے گی۔ آتے جاتے پورے راستے میں اسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہو گا۔

حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات سن کر تعجب ہوا کہ یہ کیسے ہو گا؟ اس دور میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھی راستہ میں ہیں، جب وہ عورت ہمارے علاقے سے گزرے گی تو ہمارے علاقے کے ڈاکو لٹیرے کہاں ہوں گے کہ وہ اطمینان سے سفر کر لے گی؟ لیکن سوال میرے ذہن میں گھومتا رہا، میں نے پوچھا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بات ارشاد فرما دی کہ عدی! اگر تم نے کچھ اور عمر پائی تو تم ایک اور منظر دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح ہوں گے، مدینہ میں آئیں گے اور یہاں تقسیم ہوں گے۔ کسریٰ اس زمانے کی ایک سپر پاور کا حکمران تھا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی بڑی تعجب کی تھی، میں نے

پہلا سوال تو نہیں کیا، یہ سوال کر دیا کہ یا رسول اللہ! وہ ہرمز کا بیٹا کسریٰ، فارس کا بادشاہ، آپ اس کی بات کر رہے ہیں؟ حضورؐ نے بڑے اطمینان سے سر ہلایا کہ ہاں وہی کسریٰ بن ہرمز۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میرا دماغ گھوم رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا، لیکن ایمان تھا کہ حضورؐ فرما رہے ہیں تو ایسا ہو کر رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بات ارشاد فرما دی کہ عدی! اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور تھوڑی لمبی عمر دی تو تم ایک منظر اور دیکھو گے کہ تم لوگ ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھا کر بازاروں اور منڈیوں میں جا کر آواز دو گے کہ یہ میری زکوٰۃ ہے، میرے محلے برادری میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں رہا، کوئی مستحق میری آواز سن رہا ہو تو خدا کے لیے مجھ سے زکوٰۃ وصول کر لے اور مجھے فارغ کر دے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ باتیں ارشاد فرمائیں تو یہ ان دونوں آنے والوں کو جواب دیا تھا اور ان کے مسائل کا حل بتایا تھا کہ جو نظام میں دے رہا ہوں اس پر عمل کر کے دیکھو، اس درجے کا امن ہوگا کہ کوفہ سے عورت تنہا چلے گی اور مکہ تک اسے کسی کا ڈر نہیں ہوگا، اور اس درجے کی خوشحالی ہوگی کہ تم ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھا کر ڈھونڈتے پھرو گے، تمہیں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا۔

یہ واقعہ تو حضورؐ کے زمانے کا ہے۔ حضرت عدیؓ جب یہ روایت بیان کر رہے ہیں تو وہ حضرت عمرؓ کا زمانہ ہے۔ دس پندرہ سال کے بعد بیان کر رہے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جو تین باتیں ارشاد فرمائی تھیں ان میں سے دو باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں، اور تیسری کے انتظار میں ہوں جیسے رات کو صبح کے سورج کا انتظار ہوتا ہے۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تمثیل نہیں بیان کی تھی بلکہ پیشگوئی فرمائی تھی۔ میں نے ایک خاتون کو حیرہ سے مکہ جاتے ہوئے اور مکہ سے واپس آتے ہوئے دیکھا ہے، وہ سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی تھی، کجاوہ سامان سے بھرا ہوا تھا، وہ بڑے امن اور اطمینان سے آئی اور امن کے ساتھ واپس گئی۔ پورے راستے میں کہیں بھی اس کو خدشہ نہیں ہوا کہ کوئی مجھے قتل کر دے گا، یا کوئی زیور لے لے گا، یا کوئی میری عزت لوٹ لے گا، میں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کسریٰ کے خزانے بھی فتح ہوتے دیکھے ہیں، مدینہ میں آتے اور تقسیم ہوتے دیکھے ہیں، بلکہ میں خود فتح کرنے والوں اور اٹھا کر لانے والوں شامل تھا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری پیشگوئی بھی حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پوری ہو گئی تھی

کہ تم ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھا کر ڈھونڈتے پھرو گے، تمہیں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کے دور میں یمن کا سالانہ میزانیہ

امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں یمن کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ تھے، جناب نبی کریمؐ کے زمانے میں بھی یمن کے گورنر تھے۔ پورے کا پورا یمن جناب نبی کریمؐ کے زمانے میں ریاست میں آگیا تھا، اور خود آپؐ نے ان کو یمن کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حضرت معاذ بن جبلؓ ہی یمن کے گورنر تھے۔ اس زمانے میں ایک ہی منصب ہوتا تھا، گورنر بھی وہی ہوتا تھا، ایڈمنسٹریٹر، ریونیو آفیسر اور قاضی بھی وہی ہوتا تھا، وہ عامل کہلاتا تھا۔

امام ابو عبیدؒ نے ''کتاب الاموال'' میں حضرت معاذ بن جبلؓ کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک سال اپنے صوبے سے زکوٰۃ، جزیہ، خراج اور عشر وغیرہ وصول کیا۔ جس طرح حکومت کے محکمے ریونیو لیتے ہیں، دیہاتوں میں زمینداروں سے تحصیلدار وغیرہ ٹیکس وصول کرتے ہیں اور شہریوں میں انکم ٹیکس آفیسر تاجروں اور صنعتکاروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ حضرت معاذؓ کو اپنے صوبے سے سال بھر کا جو ریونیو وصول ہوا، انہوں نے اس کا تیسرا حصہ مرکز کے کسی مطالبے کے بغیر مرکز کو بھیج دیا۔ حالانکہ صوبہ مرکز سے لیتا ہے لیکن یہاں صوبہ ایک تہائی مرکز کو بھیج رہا ہے۔ اس پر مرکز کو خوش ہونا چاہیے یا ناراض ہونا چاہیے؟

حضرت عمرؓ ناراض ہوئے اور حضرت معاذؓ کو خط لکھا۔ یہ خط بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ معاذ! تم تو عالم آدمی ہو، تمہیں پتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالیات کا یہ اصول بیان فرمایا ہے توخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم کہ زکوٰۃ اور صدقات جس علاقے کے مالداروں سے وصول کیے جائیں اسی علاقے کے مستحقین پر تقسیم کیے جائیں۔ تم نے یہ رقم مجھے کیوں بھیجی ہے، یہ تو یمن کے لوگوں کا حق ہے؟ اس پر حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ اپنے صوبے کے پورے اخراجات کے بعد یہ فاضل بجٹ تھا جو بچ گیا، اس رقم کا میرے پاس کوئی مصرف نہیں اس لیے آپ کو بھیجی ہے۔

اگلے سال حضرت معاذؓ نے اپنے صوبے کا نصف ریونیو مرکز کو بھیج دیا اور ساتھ لکھا کہ یہ رقم بچ گئی ہے، اس سے اگلے سال دو تہائی مرکز کو بھیج دیا، اور چوتھے سال پورے کا پورا بجٹ مرکز کو بھیج دیا کہ شریعت کے قانون کی برکت سے اور آپ جیسے عادل حکمران کے عدل کی برکت سے آج میرے صوبے میں ایک بھی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے جس پر خرچ کر سکوں، لہٰذا سارا بجٹ آپ کو بھیج رہا ہوں، آپ جہاں

چاہیں صرف فرمائیں۔ حضرت معاذؓ کا وہ خط آج بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ میرے پورے صوبے یمن میں کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے۔

یہ قرآن مجید کو نافذ کرنے کی برکت تھی، اللہ کے قانون کی برکت تھی اور حضرت عمرؓ جیسے عادل حکمران اور بیت المال کے نظام میں توازن کی برکت تھی۔ جب معیشت کی بات ہوتی ہے تو میں یہ ذکر کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں وسائل کی کمی کی بات نہیں ہے، وسائل کی تقسیم کی بات ہے۔ وسائل کی کمی نہیں ہوتی، لیکن تقسیم صحیح نہیں ہوتی اس لیے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً دس آدمیوں کا کھانا ہے، تین آدمی اس کو ہڑپ کر جائیں اور باقی سات بھوکے رہیں تو اس میں کھانے کا کیا قصور ہے؟ قصور چھیننے والے اور تقسیم کرنے والے کا ہے کہ دس کا کھانا تین کو کیوں دے دیا ہے؟

کسریٰ کے کنگن

دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ کے زمانے کا ہے۔ جب فارس فتح ہوا اور ایران کا کسریٰ خسرو پرویز مارا گیا۔ ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فتح کیا۔ یہ ایک الگ المیہ ہے کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ہیں جن کا ہم نام ہی نہیں لیتے، لیکن مفتوح جس نے شکست کھائی وہ رستم ایران کا چیف کمانڈر تھا، بھاگتے ہوئے نہر میں کودا تھا، پیچھے سے ایک مجاہد نے اس کی پشت پر خنجر مارا تھا جس سے وہ مرا تھا، آج وہ شکست خوردہ رستم ہمارے ہاں طاقت سمبل ہے۔ رستم گوجرانوالہ، رستم لاہور، رستم پنجاب، رستم پاکستان، رستم زماں، ہم کسی بڑے پہلوان کو یہ ٹائٹل دیتے ہیں، لیکن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا نام کوئی نہیں لیتا۔

کسریٰ کے خزانے فتح ہوئے، غنیمت مدینہ منورہ لائی گئی، دنیا کی ایک بڑی پاور نے شکست کھائی تھی تو غنیمت کا بے پناہ مال آیا۔ مجاہدین بھی مدینہ منورہ پہنچ رہے ہیں، مالِ غنیمت بھی آہستہ آرہا ہے اور فتح کی مبارک بادیں آرہی ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ مبارکبادیں بھی وصول کر رہے ہیں اور غنیمت کا مال بھی چیک کر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کسریٰ کے خزانے تقسیم کرنے تھے لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا حضرت عمرؓ ان خزانوں میں کوئی چیز تلاش کر رہے تھے، کبھی ایک گٹھڑی کھول کر اس میں دیکھتے کبھی دوسری گٹھری میں دیکھتے۔ اسی کیفیت میں سارا دن گزر گیا، حضرت عمرؓ کے رعب کی وجہ سے کوئی آپ سے پوچھ بھی نہیں رہا تھا کہ آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ اگلا سارا دن بھی اسی کیفیت میں گزر گیا کہ گٹھڑیاں اور پوٹلیاں کھول کھول کر کوئی چیز تلاش کر رہے ہیں جو

نہیں رہی۔ پریشانی بڑھتی جارہی ہے اور تلاش کرتے ہوئے یہ کہتے جارہے ہیں یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہوسکتا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ گٹھریاں کھول کھول کر دیکھ رہے ہیں، کیا تلاش کررہے ہیں؟ ہمیں بھی تو بتائیں کہ کیا نہیں ہوسکتا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے سفر میں حضرت سراقہ بن مالکؓ، جنہوں نے آپؐ کو راستے میں روکا تھا اور پھر صلح ہوگئی تھی، ان سے فرمایا تھا کہ میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی تھی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اب کسریٰ ختم ہوگیا ہے، اس کے خزانے آگئے ہیں، سراقہ بھی موجود ہے لیکن کسریٰ کے کنگن نہیں مل رہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسریٰ کے خزانے آئیں اور ان میں کنگن نہ ہوں۔ میں وہ کنگن تلاش کررہا ہوں، سارے خزانے ٹٹول کر دیکھ لیے ہیں لیکن نہیں مل رہے۔

یہی گفتگو چل رہی تھی کہ ایک سپاہی آیا اور سلام عرض کیا۔ اس کے پاس ایک پوٹلی تھی جو اس نے حضرت عمرؓ کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! میں بھی اس لشکر میں تھا جس نے کسریٰ کے خلاف جنگ لڑی ہے، میں واپسی میں راستے میں بیمار ہوگیا تھا اور ایک گاؤں میں ٹھہر گیا تھا، اب طبیعت ٹھیک ہوئی ہے تو آگیا ہوں، یہ میرے پاس ایک امانت ہے۔ جب اس پوٹلی کو کھولا تو اس میں کسریٰ کے کنگن تھے۔ سونے کے کنگن کی اپنی قیمت ہے اور کسریٰ کے کنگن کی اپنی قیمت ہے، جنہیں ایک عام سپاہی سنبھال کر لا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ یہ سونے کے کنگن راستے میں کہیں بھی غائب ہوسکتے تھے، جیسے آج کل ہمارے ہاں چیزیں غائب ہوتی رہتی ہیں، کون سی چیز سلامت پہنچتی ہے۔ ایک عام سپاہی کے ہاتھ بادشاہ کے کنگن آگئے تو وہ کہیں غائب نہیں ہوئے بلکہ اس نے خود اٹھائے اور امانت کے ساتھ خود ہی پیش کردیے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جس قوم کو اتنے دیانتدار سپاہی میسر ہوں اسے کون شکست دے سکتا ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا کہ حضرت! بات یہ ہے کہ جس قوم کا امیر اتنا دیانتدار ہو اس قوم کے سپاہی بھی ویسے ہی ہوں گے، یہ آپ کی امانت اور دیانت کی برکات ہیں۔

برکت اوپر سے نیچے چلتی ہے جیسے دولت نیچے سے اوپر جاتی ہے۔ حکمران امانتدار ہو تو برکتیں ہی

برکتیں ہوتی ہیں، پھر سپاہی اور عملہ سبھی دیانتدار ہوتے ہیں۔ اگر دولت کی گردش صحیح رہے اور حکمران دیانتدار ہوں تو برکتوں کا ماحول یہ ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ تو دنیا میں دیانت کا سمبل ہیں، صرف ہمارے نزدیک نہیں بلکہ آپؓ کو دنیا مانتی ہے۔ جب بھی امانت، دیانت اور عدالت کی بات ہوتی ہے تو پہلے چار پانچ ناموں میں حضرت عمرؓ کا نام دنیا کی تاریخ میں سر فہرست آتا ہے۔ یہ کیفیت آج کل ہم تلاش کر رہے ہیں کہ دیانت، برکت اور معاشی اصلاحات کہاں ہیں۔ جہاں سے یہ چیزیں ملتی ہیں ہم وہاں نہیں جاتے۔ مثلاً مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے، میں سارے بازار میں تلاش کر رہا ہوں، لیکن جس دکان پر وہ چیز ہے اس دکان پر نہیں جاتا، تو کیا وہ چیز مل جائے گی؟ یہی حال دیانت اور برکت کا ہے، یہ سودا جہاں سے ملتا ہے وہاں ہم جاتے نہیں، اور ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔

قیصرِ روم کا تحفہ

حضرت عمرؓ کی دیانتداری پر مورخین یہ واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ ایران شکست کھا گیا لیکن روم ابھی باقی تھا۔ روم کے بادشاہ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں خوشبو کا تحفہ بھیجا۔ جب قیصر روم کا تحفہ آیا تو حضرت عمرؓ نے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ خوشبو تقسیم کرنی ہے، کوئی سیانی سی عورت بتلائیں جو مدینہ کی عورتوں میں تقسیم کر دے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کی اہلیہ محترمہ سے زیادہ سمجھدار عورت کون ہو گی، آپ ان کو دیں وہ تقسیم کر دیں گی۔ حضرت عمرؓ نے وہ خوشبو عورتوں میں تقسیم کرنے کے لیے اہلیہ محترمہ کو دیتے ہوئے پوچھا کہ تم تقسیم کرو گی تو اپنا حصہ کتنا رکھو گی؟ عرض کیا کہ جتنا دوسروں کو دوں گی اتنا ہی خود رکھوں گی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جتنا دوسروں کو دو گی اگر اتنا ہی خود رکھو گی، تو جو دیتے ہوئے انگلیوں کے ساتھ لگ جائے گا وہ کس کھاتے میں جائے گا؟ اس لیے اپنا حصہ کم رکھنا تاکہ متوازن ہو جائے۔ دیانت اس کا نام ہے۔

حضرت عمرؓ اور زیتون کا تیل

حضرت عمرؓ کی دیانت کے بے شمار واقعات ہیں، ایک اور واقعہ عرض کر دیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ بیمار ہو گئے، پیٹ میں کوئی مسئلہ تھا، جب گڑبڑ زیادہ ہو گئی تو حکیم بلائے، انہوں نے بتایا کہ اور کچھ نہیں ہے صرف یہ ہے کہ آپ خشک جَو کی روٹی کھاتے ہیں، گھی اور زیتون استعمال نہیں کرتے، اس لیے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے، آپ کچھ دن زیتون استعمال کریں، روٹی اس میں بھگو کر کھائیں تو ٹھیک ہو جائیں

گے۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو زیتون کا تیل نہیں ہے، مجھے جو وظیفہ ملتا ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ میں روٹی زیتون کے ساتھ کھاسکوں۔ پاس بیٹھے ایک آدمی نے کہا کہ بیت المال میں زیتون کا تیل موجود ہے۔ آپؓ نے پوچھا کہ کتنا ہے؟ اس نے کہا خاصا ہے۔ آپ نے پوچھا پھر بھی کتنا ہے؟ جو زیتون بیت المال میں ہے وہ تو لوگوں کا حق ہے، اگر وہ مدینہ منورہ کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آئے گا؟ اس نے عرض کیا، حضرت! اتنا تو نہیں ہے۔ دیانت اور انصاف اس سے کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے پیٹ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ جتنا مرضی ہے گڑ گڑ کرتا رہے، تجھے وہی ملے گا جو تیرا حصہ بنتا ہے، تیرے حصے سے زیادہ تجھ میں نہیں ڈالوں گا۔

یہ میں نے رفاہی ریاست کی چند جھلکیاں ذکر کی ہیں کہ اللہ کے رسول کے احکام اور زکوٰۃ کے نظام کی برکت سے حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ آج ہم حضرت عمرؓ کو صرف برکت کے لیے یاد کرتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، ان سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ہمارے آج کے مسائل، مشکلات اور ہماری بیماریوں کا حل حضرت عمرؓ کے پاس ہے، ہم وہ نہیں دیکھتے۔ ان کے فضائل بیان کریں گے، نعرے لگائیں گے، عقیدت و محبت کا اظہار بھی کریں گے، لیکن وہ جو کر کے گئے ہیں وہ کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ بات ہمیں نوٹ کر لینی چاہیے کہ ہم جب تک حضرت عمرؓ اور خلفاء راشدینؓ کی پیروی نہیں کریں گے، ہمارا نظام ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہ حضرات صرف برکت کا باعث نہیں ہیں، ہمارے لیے آئیڈیل بھی ہیں، جب تک ہم ان کی پیروی اور ان کے نقشِ قدم پر نہیں آئیں گے، بات آگے نہیں چلے گی، ہمیں ان کے پیچھے چلنا پڑے گا، ہمیں بھی اور ہمارے حکمرانوں کو بھی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا دورِ خلافت

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ کا پرتو اور خلافتِ راشدہ کا تتمہ کہا جاتا ہے۔ آپؒ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے نوے سال بعد ۱۰۰ یا ۱۰۱ ہجری میں حکمران بنے، دو اڑھائی سال خلیفہ رہے، لیکن آج تک دنیا یاد کرتی ہے، آپ کو عمرِ ثانی کہا جاتا ہے۔ رفاہی ریاست کے حوالے سے ان کے عہدِ خلافت کا واقعہ ذکر کرتا ہوں۔

"کتاب الاموال" کی روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے میں عراق کے گورنر عبد الحمیدؒ تھے۔ امیر المومنین کے نام ان کا خط آیا کہ ہمارے صوبے کا اس سال کا جو ریونیو

وصول ہوا ہے، ضروریات پوری ہونے اور سال کا بجٹ پورا ہونے کے بعد فاضل بجٹ میں رقم بچ گئی ہے، اس کا کیا کرنا ہے؟ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب لکھا کہ صوبے میں اعلان کراؤ کہ کوئی ایسا مقروض جو اپنا قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اس کا قرض ادا کر دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ کام میں کر چکا ہوں، رقم اس سے زائد ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کو دوبارہ خط لکھا کہ جن لوگوں کی بچیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں اور اس انتظار میں ہیں کہ اخراجات ہوں گے تو ان کی شادیاں کریں گے، تو ان کی شادیاں اس رقم سے کروا دو۔ گورنر صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ حضرت! میں یہ بھی کر چکا ہوں۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گورنر صاحب کو خط لکھا کہ جن خاوندوں نے اپنی بیویوں کو مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، تو آپ اس رقم سے ان کے مہر ادا کر دیں۔ انہوں نے جواب لکھا کہ حضرت! یہ بھی کر چکا ہوں۔ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے چوتھا خط لکھا کہ جو زمینیں قابلِ کاشت ہیں اور ویران پڑی ہوئی ہیں، ان کی حد بندی کراؤ اور لوگوں کو زراعت کے لیے آسان قسطوں پر بطور قرض دے دو۔

یہ ہے رفاہی ریاست اور بیت المال کا تصور۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ماحول دیا تھا وہ چلتے چلتے یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ بات میں نے کراچی میں ایک اجتماع میں بیان کی تو ایک نوجوان کھڑا ہو گیا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا اٹلانٹک سی تھا کہ صوبے کے خرچے بھی پورے ہو رہے ہیں، تنخواہیں بھی پوری ہو رہی ہیں، مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہو رہے ہیں، بے نکاحوں کی شادیاں بھی ہو رہی ہیں اور مہر بھی ادا ہو رہے ہیں؟ اس کا سوال یہ تھا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا کوئی سمندر تھا؟ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا، تمہارا سوال ٹھیک ہے، لیکن ایک واقعہ اور سن لو تو اس سوال کا جواب بھی سمجھ میں آجائے گا۔

ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلافت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد شام کو گھر تشریف لائے تو راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے، جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔ آپؒ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبد الملک رحمہا اللہ بڑی اچھی خاتون تھیں، بادشاہ کی بیٹی، بادشاہ کی بیوی، اور بادشاہ کی بہن تھی۔ عبد الملک کی بیٹی تھی، کمانڈر انچیف مسلمہؒ کی بہن تھی، اور ان کا بھائی ولیدؒ بھی بعد میں بادشاہ بنا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گھر آکر اہلیہ سے کہا کہ فاطمہ! تمہارے پاس ایک آدھ درہم ہوگا؟ ضرورت پڑ گئی ہے۔ درہم ساڑھے تین ماشے چاندی کا ہوتا ہے، اس وقت دو تین سو کا ہوگا۔ امیر المؤمنین، دمشق کا حکمران کہ آدھی دنیا اس کے تابع ہے، اور بیوی سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ایک آدھ درہم بچا کر رکھا ہوا

ہے؟ بیوی نے پوچھا، کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ ایک آدھ درہم گھر میں ہو تو انگور لے لیں۔ اہلیہ نے کہا آپ کی جیب میں نہیں ہے تو میرے پاس کہاں سے آئے گا؟ پھر اہلیہ نے بیویوں والی بات بھی کی کہ آپ امیر المومنین ہیں اور آپ کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ انگور خرید سکیں۔ میں آج کی زبان میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں کہ آپ کے اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں کہ ایک درہم کے انگور منگوا کر کھالیں۔ آج کی اصطلاح میں اس کو ’’صوابدیدی فنڈ‘‘ کا نام دیا جاتا ہے جو ہر حاکم کا اختیار ہوتا ہے جہاں چاہے خرچ کرے۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تاریخی جواب دیا۔ فرمایا، فاطمہ! جس درہم کی تم بات کر رہی ہو، وہ درہم نہیں، آگ کا انگارہ ہے۔

میں نے اس سوال کرنے والے نوجوان سے کہا بیٹا! جس ملک کا حکمران سرکاری خزانے کو آگ کا انگارا سمجھے گا، اس کے بجٹ میں پیسے ہی پیسے ہوں گے۔ پھر مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، مہر بھی ادا ہوں گے، اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارا سمجھے۔

میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ آپ نے اعلان فرمایا تھا من ترک مالاً فلورثتہ کہ جو آدمی مال چھوڑ کر فوت ہوا، اس کا مال وارثوں کا ہے ومن ترک کلاً او ضیاعاً فالیَّ وعلیَّ جو آدمی بوجھ اور قرضہ چھوڑ کر مرا، یا بے سہارا خاندان چھوڑ کر مرا، وہ ہمارے پاس آئیں گے، ہمارے ذمے ہوں گے۔ یہ اسلامی فلاحی ریاست کی بنیاد ہے جس پر حضرات خلفائے راشدینؓ بالخصوص حضرت عمر بن خطابؓ اور بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عمارت تعمیر کی ہے، آج کی دنیا کے لیے بھی وہ آئیڈیل ہے۔

دورِ حاضر میں رفاہی ریاست کا تصور

آج کے معروضی حقائق کیا ہیں اور آج کی دنیا میں رفاہی ریاست کا تصور کیا ہے؟ اس پر دو تین واقعات بتاتا ہوں۔ ریاست اپنی رعیت کے نادار اور معذوروں کو وظیفہ دے اور اپنی رعیت کے تمام لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرے، اس حوالے سے آج کی دنیا میں اگر کوئی آئیڈیل اسٹیٹ ہے تو وہ برطانیہ ہے۔ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ کا اس وقت ویلفیئر سسٹم میں مثالی نظام ہے، وہاں ناداروں کو وظیفہ ملتا ہے، بچوں کو وظیفہ ملتا ہے، معذوروں کو وظیفہ ملتا ہے، کم آمدنی والوں کو ان کے اخراجات

پورے کرنے کے لیے وظیفہ ملتا ہے۔ ایک پورا نظام ہے ، اس کی ایک چھوٹی سی جھلک ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مولانا عزیز الحق ہزاروی بنوری ٹاؤن کے فارغ ہیں اور میری بھانجی کے خاوند ہیں، برطانیہ کے شہر برنلے میں رہتے ہیں، انہوں نے ایک چرچ خریدا ہے اور اسے مدرسہ بنا کر تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ چند سال پہلے انہوں نے مجھے بتایا کہ ماموں! اس سال ایک واقعہ ہوا کہ یہاں سردی زیادہ پڑی ہے تو ایک دن میونسپل کمیٹی کی طرف سے شہر کے ہر گھر میں ڈاک کے ذریعے بیس بیس پاؤنڈ کا چیک آیا ہے، کسی مطالبے کے بغیر۔ اور چیک کے ساتھ ایک چٹ ہے جس پر لکھا ہے کہ اس مہینے سردی زیادہ پڑی ہے، آپ کا گیس زیادہ صرف ہوا ہوگا اور بل زیادہ آیا ہوگا، اس بل میں ہماری طرف سے یہ مدد شامل کر لیں۔ یہ چھوٹی سی جھلکی اور امر واقعہ ہے۔

جس چائلڈ الاؤنس کا آغاز حضرت عمرؓ نے کیا تھا آج بھی دنیا کی بہت سی ریاستوں میں چائلڈ الاؤنس دیا جاتا ہے۔ میں برطانیہ جس زمانے میں جایا کرتا تھا تو نو پونڈ فی ہفتہ ہر بچے کو وظیفہ ملا کرتا تھا۔ پانچ بچے ہوں تو پوری تنخواہ بن جاتی ہے۔ میں جس علاقے میں رہتا تھا وہاں بنگالی زیادہ ہیں، وہاں کا ایم پی اے بھی بنگالی ہوتا ہے، وسطی لندن کا علاقہ بنگالیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مولانا عیسیٰ منصوری میرے میزبان تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا بنگالی کام نہیں کرتے، سارا دن گپیں لگاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کو کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کسی کے دس سے کم بچے نہیں ہیں، انہیں بچوں کا وظیفہ ملتا ہے جس سے سارے گھر کا گزارا ہوتا ہے۔

برطانیہ کے علاوہ کئی دیگر مغربی ممالک میں بھی چائلڈ الاؤنس ملتا ہے۔ مثلاً ڈنمارک اور برطانیہ کے ساتھ ہی شمالی یورپ کی ریاست ناروے ہے۔ ناروے میں بھی یہی سسٹم ہے بچوں، ناداروں، معذوروں، طلباء اور بے سہارا لوگوں کو گورنمنٹ وظیفے دیتی ہے۔ ناروے میں اس وقت بھی جو سوشل بینیفٹ کا سسٹم ہے اسے کہتے ہی "عمر لاء" ہیں اور بچوں کو ملنے والے وظیفے کو "عمر الاؤنس" کہتے ہیں اور وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے یہ سب حضرت عمرؓ سے لیا ہے۔

میں یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ وزیر آباد کے سابق ایم این اے جسٹس افتخار چیمہ ہمارے دوست ہیں، اب ان کے بھائی ڈاکٹر نثار چیمہ ایم این اے ہیں۔ انہوں نے ایک مجلس میں یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم کیمبرج یونیورسٹی میں لاء کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہاں ایک عمر رسیدہ انگریز دانشور تھا، لوگ اس سے ملنے

آیا کرتے تھے۔ آدمی دانشور سے ملے تو دانش کی بات ہی سنتا ہے، ایسے لوگوں سے ملتے رہنا چاہیے، کوئی کام کی بات مل جاتی ہے۔ افتخار چیمہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی شہرت سن رکھی تھی تو ہم تین چار پاکستانی ساتھی اس کے پاس گئے، تعارف کرایا اور بتایا ہم پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں۔ اس وقت پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ تو وہ بہت خوش ہوا کہ تم نے اسلام کے لیے ریاست بنائی ہے۔ باتوں باتوں میں بچوں کو وظیفہ دینے کا ذکر چھڑ گیا، اس انگریز نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ برطانیہ میں ویلفیئر اسٹیٹ کا جو سسٹم ہے اور بچوں، بے روزگاروں اور معذوروں کو وظیفہ ملتا ہے، یہ نظام کس نے مرتب کیا تھا اور یہ قانون کس نے بنایا تھا؟ ہم نے کہا ہمیں تو معلوم نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ پارلیمنٹ کی جس کمیٹی نے یہ سارا سسٹم ڈیزائن کیا تھا اور سوشل بینی فٹس کا قانون بنایا تھا، میں اس کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے یہ سارا سسٹم کہاں سے لیا تھا؟ میں نے یہ سب جنرل عمرؓ سے لیا تھا۔ مغرب والے حضرت عمرؓ کا نام لیتے ہیں تو ان کو جنرل عمر کہتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد کی بات بھی نقل کرنا چاہتا ہوں، جو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروگرام میں بیان کی جس میں میں بھی شریک تھا۔ انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں ناروے گیا، وہاں بچہ پیدا ہونے پر اس کو وظیفہ ملتا ہے اس وظیفے کا نام "عمر الاؤنس" ہے۔ کہتے ہیں یہ نام سن کر مجھے تجسس ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نام سے الاؤنس ناروے میں، اس کا کیا مطلب؟ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ صرف عمر الاؤنس نہیں بلکہ وہاں سوشل بینی فٹس اور وظیفوں کا جو سسٹم ہے اس کو "عمر لاء" کہتے ہیں۔ ناروے کے دستور میں "عمر لاء" کا ذکر ہے۔ حضرت عمرؓ اس بنیاد پر بچوں کو وظیفہ دیتے تھے کہ خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہوا ہے تو بجٹ میں اضافہ ہوا ہے، تو اس کا بوجھ بیت المال برداشت کرے گا۔

میں نے ذکر کیا کہ رفاہی ریاست کیا ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا ماحول دیا ہے؟ یہی ماحول حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں ویلفیئر اسٹیٹ کا معیار بنا جسے آج تک دنیا فالو کر رہی ہے، جبکہ ہم نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ سوسائٹی کے نادار افراد کی کفالت اور بے سہارا لوگوں کی مدد ریاست کے ذمے ہے، یہ تصور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا، اس پر خلفائے راشدین نے ایک پورے نظام کی بنیاد کھڑی کی، لیکن آج وہ نظام ہم مسلمان ملکوں میں نہیں ہے، غیر مسلم ملکوں میں ہے۔ حضرت عمرؓ کا بیت المال کا نظام آج بھی دنیا کے لیے مثالی ہے، لیکن ہمارے لیے

آئیڈیل نہیں ہے۔ چنانچہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ایک اسلامی ریاست ہو اور وہ اپنے شہریوں کے تمام حقوق بحال کر کے ایک رفاہی ریاست کا دنیا کے سامنے تصور پیش کرے۔ اللہ کرے وہ دن آئے اور ہم ایک اسلامی ریاست کے ذریعے خلفائے راشدین کے نظام کا ایک اور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

پاکستان بنتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگی، لیکن کیا پاکستان وسائل کے اعتبار سے غریب ملک ہے؟ نہیں! پاکستان اپنے وسائل کے اعتبار سے دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں سے ہے، ہمیں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر چیز عطا کی ہوئی ہے، صرف دو باتوں کی ضرورت ہے:

1. حکمران سرکاری مال کو آگ کا انگارا سمجھیں،
2. اور حکومت کو یہ فکر ہو کہ مقروضوں کے قرضے ادا کرنے ہیں، کنواروں کی شادیاں کرنی ہیں، خاوندوں کے مہر ادا کرنے ہیں، کسانوں کو قرضے دینے ہیں۔

حکمرانوں کا یہ مزاج ہو جائے تو پاکستان کسی سے کم بھی نہیں ہے، صرف اس رخ پر واپس جانے کی ضرورت ہے۔

خلافت کے ادوار

خلافت کا تاریخی پس منظر، نظریہ امامت و خلافت، خلافت کے مختلف معیارات، خلافت کے نظام کا ابتدائی تعارف، اور اسلام کے رفاہی ریاست کا تصور ذکر کرنے کے بعد خلافت کے جو مختلف ادوار گزرے ہیں ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

خلافتِ بنواُمیہ

خلافتِ راشدہ کے بعد جو تاریخی طور پر خلافت کا دور گنا جاتا ہے وہ خلافتِ بنو امیہ کا دور ہے۔ مورخین خلافتِ بنوامیہ کا آغاز سیدنا حضرت امیر معاویہؓ سے کرتے ہیں کیونکہ وہ حضرت حسنؓ کی بیعت کے بعد مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین بنے اور تقریباً بیس سال آپ نے پوری امتِ مسلمہ کے اجتماعی امیر اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے دنیا میں حکومت کی۔ اس کے بعد یزید کا دور آتا ہے۔ یزید نے چار سال ۶۰ھ سے ۶۴ھ تک حکومت کی ہے۔ یزید کے زمانے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ حضرت حسینؓ خانوادۂ نبوت سمیت کربلا میں شہید ہوئے، واقعہ حرہ پیش آیا، مدینہ والوں نے بغاوت کر دی، قتلِ عام ہوا۔ یزید کے فوت ہونے کے بعد اس کے بیٹے اور حضرت معاویہؓ کے پوتے معاویہ ثانی کو خلیفہ نامزد کیا گیا، لیکن انہوں نے باقاعدہ خلافت نہیں سنبھالی۔ دو تین مہینے خلافت کی لیکن معذرت کرتے ہوئے کہ میں اس کام کو نہیں کر سکتا، میرے باپ کے دور میں امت کے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں، میں اس میں شریک نہیں ہوتا، چنانچہ معاویہ ثانی نے دو تین مہینے میں ہی خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی۔

اس کے بعد ایک نئی بحث چھڑتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مدینہ منورہ میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ آپؓ نے ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک تقریباً نو سال حکومت کی ہے۔ آپ کی خلافت کا دائرہ گھٹتا بڑھتا رہا۔ ایک زمانے میں عراق، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور حجاز آپ کے ماتحت تھے جہاں آپ کی خلافت کا دور چلا۔ لیکن پھر آپ کی خلافت سمٹتے سمٹاتے مکہ مکرمہ تک محدود رہ گئی۔ ادھر حضرت

عبداللہ بن زبیرؓ خلیفہ تھے، ادھر مروان بن الحکمؒ نے اپنی امارت کا اعلان کر دیا۔ اس لیے یہ دور بھی محققین کے ہاں متنازع دور کہلاتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ، امام ذہبیؒ اور ابن حجر مکیؒ وغیرہ حضرات کہتے ہیں کہ اس دور میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ چونکہ صحابی تھے اور آپ نے خلافت کا اعلان پہلے سے کیا ہوا تھا، اس لیے آپ ہی امیر المومنین تھے۔ بہت سے محققین حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی موجودگی میں مروان بن الحکمؒ کو امیر المومنین نہیں مانتے۔ لیکن یہ متنازعہ ہے، دونوں موقف ہیں اور دونوں طرف دلائل ہیں۔ مروان بن الحکمؒ نے دو سال حکومت کی ہے۔ پھر جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مکہ مکرمہ کے محاصرے کے دوران حجاج بن یوسف کے ہاتھوں حرم پاک میں شہید ہوئے تو یہ عبدالملک بن مروان کا دور تھا۔ ۶۵ھ میں عبدالملک بن مروان خلیفہ بنے اور دنیا کے متفقہ امیر المومنین رہے۔ عبدالملک بڑا باہمت خلیفہ تھا۔ اس کے بعد عبدالملک کے بیٹے ولید خلیفہ بنے۔ پھر ان کے بیٹے سلیمان خلیفہ بنے۔ پھر ان کے بھتیجے عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے۔ پھر عبدالملک کے بیٹے یزید خلیفہ بنے۔ پھر ہشام بن عبدالملک خلیفہ بنے۔ پھر ان کے پوتے ولید ثانی خلیفہ بنے۔ تقریباً ۴۱ھ سے ۱۲۶ھ تک بنوامیہ کی خلافت کا دور رہا ہے۔

بنوامیہ کی خلافت کے دوران حضرت حسینؓ تو کوفہ کی طرف آئے تھے اور راستے میں شہید ہو گئے، لیکن ان کے علاوہ اور بھی علویین اور عباسیین وقتاً فوقتاً خروج کرتے رہے ہیں۔ اتباع تابعین کے دور میں حضرت امام زید بن علیؒ، امام محمد ابراہیم نفس زکیہؒ کا خروج چلتا رہا۔ حضرت علیؓ کی اولاد بھی دو تین پشتوں تک مزاحمت کرتی رہی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

خلافتِ بنوعباس

حضرت عباسؓ کی اولاد نے بھی مزاحمت کی۔ بالآخر ۱۲۶ھ کے لگ بھگ بغاوت، خروج اور مزاحمت میں کامیاب ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پڑپوتے عبداللہ بن علی سفاح خلیفہ بنے۔ یہ عباسی دور کے پہلے خلیفہ ہیں۔ انہوں نے ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کے خلیفہ کو لڑائی میں شکست دے کر کوفہ اور دمشق پر قبضہ کر لیا اور خلافت سنبھال لی۔ یوں بنوعباس کے دورِ خلافت کا آغاز ہوا۔ پھر بنوعباس کے خلافت ۶۵۶ھ تک چلتی رہی۔ یہ تقریباً سوا پانچ سو سال بنتے ہیں۔ ۶۵۶ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد میں شہید ہوئے۔ عباسیوں میں بڑے بڑے نامور خلیفہ آئے ہیں ہارون الرشید، مامون الرشید اور مہدی وغیرہ۔ جب ایک سلسلہ چلتا ہے تو اس میں اچھے لوگ بھی

آتے ہیں، کمزور بھی آتے ہیں، لیکن بہرحال ان کا دور تمدن اور ترقی کے اعتبار سے عالمِ اسلام کے عروج کا دور ہے۔

اس زمانے میں خلافت بنو عباس کی دو تین سو سال یہ کیفیت رہی ہے کہ دنیا کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی، عالم اسلام کی قیادت کر رہے تھے، لیکن آہستہ آہستہ زوال کی طرف مائل ہوتے گئے۔ جب تاتاریوں اور ہلاکو خان نے عالمِ اسلام پر یلغار کی اور اس میں بغداد کو نشانہ بنایا تو اس وقت بغداد میں شیعہ سنی تنازع بڑی شدت پر تھا۔ خلیفہ مستعصم باللہ سنی تھا اور اس کا وزیر ابن العلقمی شیعہ تھا۔ ان کی آپس کی اندرون خانہ چپقلش تھی۔ شیعہ سازش بالآخر کامیاب ہوئی، ابن العلقمی ہلاکو کے ساتھ مل گیا، اس سے ساز باز کر کے خلیفہ اور اس کے خاندان کو قتل کروا دیا اور ہلاکو خان کا بغداد پر قبضہ کروا دیا۔ اس دوران بغداد میں بہت بڑی تباہی پھیلی، کئی دن تک قتل عام ہوتا رہا، دریا میں خون بہتا رہا، لائبریریاں جلائی جاتی رہیں، ہلاکو خان نے بغداد کو تہ و بالا کر دیا اور عباسیہ سلطنت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ دنیا کی تاریخ میں جو بڑی تباہیاں ہیں ان میں سے ایک سقوطِ بغداد کا سانحہ بھی ہے۔

جب بغداد میں ہلاکو خان نے قبضہ کر کے تباہی پھیلا دی تو ادھر مصر میں عباسی سلطنت ملوک کی آزاد حکومت ہوتی تھی۔ ملک ظاہر بیبرس وہاں کے حکمران تھے۔ انہوں نے خلافت کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے ان میں سے ایک شہزادے کو بلایا اور اپنا خلیفہ تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ عباسی خلفاء مصر میں بھی ۶۵۹ھ سے ۹۲۳ھ تک رہے ہیں لیکن یہ برائے نام خلیفہ تھے، ان کی حیثیت صرف سرپرست کی تھی۔ صلاح الدین ایوبیؒ، مصر اور شام کے علاقے میں ملک ظاہر بیبرس اور دیگر بھی جو حکمران تھے وہ ان کا ٹائٹل استعمال کرتے تھے، یہ عباسی خلفاء صرف تبرک کے لیے ہوتے تھے۔ ان کے پاس کچھ تبرکات تھے یعنی اب عباسی سلطنت برائے نام تھی۔

اصل جو عباسی سلطنت تھی وہ بڑی باہیبت و باجبروت حکومت تھی اور اپنے دور میں انہوں نے دنیا پر حکومت کی ہے، لیکن ۶۵۶ھ میں مستعصم باللہ کے قتل اور سقوطِ بغداد کے بعد یہ تین سال ادھر ادھر لاوارث پھرتے رہے۔ پھر ملک ظاہر بیبرس نے ان کو مصر اور شام کے علاقے میں بلا لیا اور کہا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ ہماری سرپرستی کریں، ہم آپ کی سرپرستی میں خلافت کے نام پر حکومت کریں گے۔ پھر نام ان عباسی خلفاء کا ہوتا تھا اور حکومت وہ حکمران کرتے تھے۔ بہرحال عباسی خلفاء کا نام چلتا رہا جو کہ سلطنت عباسیہ مصر کہلاتی ہے۔ یہ دوسرا دور ہے جو عباسیوں کی خلافت کا ہے۔

اندلس میں مسلم حکومت

اندلس یورپ کا ایک حصہ ہے، آج کل اس کو اسپین کہتے ہیں۔ اندلس اُس دور کے ہسپانیہ کا ایک حصہ تھا۔ مراکش جو کہ اقصیٰ مغرب کہلاتا ہے، اس سے آگے یورپ شروع ہوتا ہے، اس میں اندلس ہے۔ افریقہ کی فتوحات حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شروع ہوگئی تھیں۔ مراکش بھی افریقہ کا حصہ ہے۔ افریقہ سے یورپ کی طرف بنوامیہ کے دور میں طارق بن زیادؒ اور مسلم بن نصیرؒ وغیرہ جرنیلوں نے پیشرفت کی، جو حملہ آور ہوکر علاقوں پر قبضہ کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۹۲ھ سے شروع ہوگیا تھا، یعنی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے اَسی اکیاسی سال بعد یورپ میں ہمارا داخلہ براستہ اندلس شروع ہوگیا تھا۔

بنوامیہ کی خلافت کے خلاف بنوعباس کی مہم ایک عرصے سے چل رہی تھی، یہ پرانی کشمکش تھی۔ بنوہاشم بھی بنوامیہ کے خلاف لگے رہے۔ امام زیدؒ اور امام نفس زکیہؒ نے بھی خروج کیا، لیکن اس میں بنوعباس کا دائرہ اپنا تھا اور بنوعلی کا دائرہ اپنا تھا۔ بنوعلی کو باوجود خروج کے حکومت پر کنٹرول حاصل نہیں ہوا۔ بنوعباس بالآخر بنوامیہ کو گرانے میں اور ان کی جگہ بنوعباس کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

ہماری سیاسی تاریخ کے دو پہلو

ہماری سیاسی تاریخ بڑی شاندار بھی ہے لیکن بڑی اندوہناک بھی ہے۔ دونوں پہلو عروج پر ہیں۔ جب ہم شاندار پہلو پر آتے ہیں تو ہماری سیاسی تاریخ بڑی عظمت کی تاریخ ہے، لیکن جب دوسرے پہلو پر آتے ہیں کہ ہم نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا اور ہم نے کیسے تباہیاں کیں تو وہ اندوہناک باب بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ جب بنوعباس کے ہاتھوں بنوامیہ کی حکومت ختم ہوئی اور بنوعباس نے حکومت سنبھالی تو اموی حکمرانوں، شاہی خاندان اور اس بنوامیہ کے خاندان پر، جنہوں نے کم وبیش ایک سو سال حکومت کی تھی، انتقام کی وہ آگ برسائی کہ یہ جان کی امان کے لیے چھپتے پھرتے رہے، کہیں اِدھر کہیں اُدھر، ان کو کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا۔ جہاں جاتے، کوئی نہ کوئی دشمن آجاتا۔ ابوعبداللہ سفاح پہلے عباسی خلیفہ ہیں، ان کو سفاح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ خونریزی کی تھی۔ اور جب ایک اقتدار گرا کر دوسرا اقتدار میں جگہ لیتا ہے تو یہ فطری بات ہے ایسے ہوتا

ہے۔ اور یہ بھی واضح بات ہے کہ سب سے زیادہ قتلِ عام حریف کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ملکہ بلقیس نے کہا تھا ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ و کذلک یفعلون (النمل ۳۴) بادشاہوں کا سب سے پہلا ہدف پہلے کی اشرافیہ اور حکمران طبقات کو نیچے لانا ہوتا ہے۔ ضمناً کہہ دوں کہ یہاں بھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار سنبھالا تھا اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی اقتدار آگیا تھا تو چونکہ اقتدار مسلمانوں سے لیا تھا اس لیے سب سے زیادہ نشانہ مسلمانوں کو ہی بنایا گیا۔ یہی بات بنو امیہ کے ساتھ ہوئی کہ بنو عباس نے بنو امیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا۔

بنو امیہ میں سے ایک شہزادہ سمجھدار نکلا، اس نے مزاحمت نہیں کی۔ اندلس کا علاقہ بنو امیہ کے ہی زمانہ میں فتح ہوا تھا، تو اس نے وہاں رہ کر مزاحمت کرنے کی بجائے ایک طرف ہو کر اندلس کا علاقہ سنبھال لینے کو ترجیح دی۔ وہ شہزادہ عبد الرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبد الملک بن مروان تھا۔ یہ چپکے سے وہاں سے نکلا اور بچتا بچاتا اندلس جا پہنچا۔ ظاہر بات ہے ہر آدمی کے کچھ حمایتی بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ اندلس کا سارا انتظام انہی کے دور میں ہوا تھا تو اس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ وہ اس کی قدر کریں گے۔ اس نے اندلس کے ساحل پر اترتے ہی اپنی خلافت کا اعلان کر دیا کہ میں خاندانِ خلافت کا فرد ہوں اور خلیفہ کا پوتا ہوں، یہاں میں اپنی امارت کا اعلان کر رہا ہوں۔ وہاں مقامی حکمرانوں سے مزاحمت ہوئی لیکن عبد الرحمٰن نے بڑھتے بڑھتے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

اس کو عبد الرحمٰن الاول اور عبد الرحمٰن الداخل بھی کہتے ہیں۔ یہ اندلس میں بنو امیہ کی سلطنت کا بانی ہے ۱۳۸ھ میں یہ اندلس میں داخل ہوا۔ جس جس اموی کو علم ہوا کہ عبد الرحمٰن الداخل نے اندلس میں حکومت قائم کر لی ہے، وہ وہاں سمٹتے چلے گئے اور ایک مستحکم حکومت قائم ہو گئی۔ اس طرح بنو امیہ کی خلافت اندلس منتقل ہو گئی، پھر اندلس میں بنو امیہ نے صدیوں حکومت کی۔ عبد الرحمٰن کے بعد دوسرے خلفاء آئے، اندلس میں امویوں کا دور بڑا شاندار دور ہے۔ دمشق میں تو یہ پٹ گئے تھے لیکن اندلس میں جا کر امویوں نے حکومت سنبھال لی اور ۳۹۹ھ تک بنو امیہ کی وہاں حکومت رہی، جہاں ان کے دس خلیفہ گزرے ہیں، یہ بھی خلافتِ بنو امیہ کہلاتی ہے۔ فرق یہ پڑا کہ خلافتِ بنو امیہ دمشق سے منتقل ہو کر اندلس چلی گئی، جبکہ اُدھر بنو عباس نے خلافت قائم کر کے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا۔

بعد میں بنو امیہ خلفشار کا شکار ہوئے۔ مختلف خاندان قبضہ کرتے رہے، حکومتیں کرتے رہے، مثلاً بنو حنوط پھر بنو عباد پھر مرابطین پھر موحدین پھر بنو ہود۔ یہ طوائف الملوکی ہو گئی۔

مسلم تہذیب وتمدن کا عروج

اموی دور میں اندلس کی حکومت مستحکم تھی، اس نے بڑی ترقی کی، اور اس دور کے اندلس کو آج بھی دنیا یاد کرتی ہے۔ اِدھر تہذیب کا مرکز بغداد تھا اور اُدھر تہذیب کا مرکز غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ اور تاریخ مانتی ہے یورپ کو تہذیب و تمدن، حقوق اور تعلیم سے روشناس کرانے والا غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ انہوں نے تقریباً تین سو سال وہاں حکومت کی، پھر غرناطہ الگ ہوگیا، قرطبہ الگ ہوگیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتی گئیں، لیکن مجموعی طور پر یہ اقتدار مسلمانوں کے ہی پاس رہا۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی جنگیں ہوتی رہیں، آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ چلتے چلتے ۸۹۷ھ میں مسلمانوں کو وہاں سے مکمل شکست ہوئی۔ غرناطہ میں ابو عبداللہ جو ہمارا آخری حاکم تھا، اس کا عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے ساتھ کے ساتھ معاہدہ ہوا اور وہ وہاں سے نکلا۔

اس طرح ۹۲ھ سے شروع ہوکر ۸۹۷ھ تک تقریباً آٹھ سو سال ہماری وہاں حکومت رہی۔ جس میں سے تین چار سو سال تو مضبوط حکومت تھی، پھر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور رخصت ہی ہوگئے۔

اس دوران یورپ پر اثرات کیا ہوئے اور ہم پر اثرات کیا ہوئے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ اندلس پر بنو امیہ کی خلافت قائم ہونے کے بعد باقی علاقہ بنو عباس کے لیے آزاد ہوگیا تھا تو یہاں بنوامیہ نے بنو عباس سے مزاحمت نہیں کی۔ پھر بنو عباس سے ہلاکو خان نمٹتا ہے، اِدھر تاتاری آئے، لیکن بنوامیہ سمندر پار دوسرے علاقے میں بڑی دلجمعی کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

اس دوران یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کی مجموعی صورتحال یہ تھی کہ نہ وہاں تعلیم تھی، نہ ہنر تھا، نہ حقوق تھے، مکمل جاہلیت کا منظر تھا، عرب جاہلیت سے بھی بدتر۔ یورپ میں حکمران بادشاہ تھا، جاگیردار تھا اور پاپائے روم تھا۔ جاگیرداروں کے مزارعین جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا، جو کہہ دیا وہی قانون ہے، اور پاپائے روم ان کے پشت پناہ ہوتے تھے، مذہبی قیادت ان کا ساتھ دیتی تھی۔ وہاں جاکر علم کی بات سب سے پہلے مسلمانوں نے کی۔ یورپ کا مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ مسلمان کی بجائے عربوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں تعلیم، تہذیب، تمدن اور ثقافت سے عربوں نے روشناس کرایا، ہمیں ایک دوسرے کے حقوق کی پہچان عربوں نے کروائی، سائنس اور ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی بنیاد عربوں نے رکھی، یہ بات وہ مانتے ہیں۔

یورپ پر تو یہ اثرات ہوئے کہ یہاں کی تعلیم گاہیں پورے یورپ کی تعلیم کا مرکز تھیں۔ تقریبًا تین چار صدیاں یہ ماحول رہا ہے کہ جس طرح آج ہمارے ہاں لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ، فرانس اور امریکہ جاتے ہیں، اُس زمانے میں پورے یورپ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے غرناطہ، اندلس کا رخ کیا جاتا تھا۔ یہ مہذب اور تعلیم یافتہ ملک شمار ہوتا تھا۔ یورپ میں علمی شعور اور حقوق کا شعور داخل کرنے کا سبب اندلس بنا ہے۔ اندلس نے بڑے بڑے علماء پیدا کیے ہیں، مثلاً امام قرطبی، ابن خلدون وغیرہ۔ علم کا تعارف مغرب کو مسلمانوں نے کرایا ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی بنیاد بھی مسلمانوں نے فراہم کی ہے، اور حقوق کا تعارف بھی مسلمانوں نے کروایا، مغرب اس کا اعتراف کرتا ہے۔

جب کوئی زمانہ شمار ہوتا ہے تو ابتدائی ایک سو سال اس کے ارتقا کا زمانہ ہوتا ہے، اور آخری سو، سوا سو سال تنزل کا زمانہ ہوتا ہے، عروج کا زمانہ درمیان کا ہوتا ہے۔ جیسے بنوامیہ کے اس آٹھ سو سال کے دور میں عروج کا دور تین سو سال کا تھا۔ علم، تہذیب، تمدن، فلسفہ کے لیے طاقت کی پشت پناہی ضروری ہوتی ہے ورنہ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف علم، صرف تہذیب اور صرف فلسفہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اگر دنیا پر ہزار سال حکومت کی ہے تو ہماری بنیاد علم اور اخلاقیات پر تھی، لیکن پشت پر طاقت تھی۔ آج اگر دنیا پر مغرب کا فلسفہ حکمرانی کر رہا ہے اور ہماری خواہشات کے علی الرغم کر رہا ہے، ہمارا ایک لمحہ کے لیے بھی جی نہیں چاہتا کہ ہم مغربی فلسفے کو قبول کریں لیکن ہمیں قبول کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ اس کی پشت پناہی طاقت کر رہی ہے۔ مغرب کا فلسفہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود، تمام تر اعتراضات کے باوجود، دنیا کی مختلف قوموں کے تمام تر تحفظات کے باوجود آج دنیا کا حکمران ہے۔ جس کے سامنے چائنہ بھی بے بس ہے، چائنہ معیشت کے میدان کے میں ٹکر لے رہا ہے، فلسفے اور تہذیب و تمدن کے محاذ پر وہ وہیں کھڑا ہے جہاں مغرب کھڑا ہے، یہ سب کچھ طاقت کے بل بوتے پر ہو رہا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا

؎ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

نبوت کے ساتھ بھی طاقت ضروری ہے، حضرت داوٗدؑ طاقت کے ذریعے ہی خلیفہ بنے۔ خلیفہ بننے کے لیے جالوت کو قتل کیا تھا و قتل داؤد جالوت و اٰتٰه الله الملک و الحکمة و علمه مما یشاء (البقرہ ۲۵۱)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں پہلے انہوں نے جالوت کو قتل کیا پھر میں نے ان کو حکومت، نبوت اور خلافت دی۔ مذہب، دین، عقیدہ آسمان سے آتا ہے اور دنیا میں طاقت ملتی ہے تو نظام چلتا ہے۔ ہم

آج مار کھا رہے ہیں کہ طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جس کے پاس طاقت کا توازن نہیں ہے وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، دوسروں پر حکومت کیا کرے گی۔ قرآن پاک کے ایک نکتے کی طرف اشارہ کروں گا۔ قرآن پاک نے طاقت کا معیار یہ بتایا ہے واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل (الانفال ٦٠) قوت کا ترجمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا الاان القوۃ ھی الرمی قوت رمی کا نام ہے۔ رمی کا معنی پھینکنا اور ہتھیار پہنچانے کی صلاحیت ہے۔ آج کی دنیا میں سب سے بڑی دوڑ اس بات میں ہے کہ ایک کہتا ہے میرے میزائل کی چھ ہزار میل تک رسائی ہے، دوسرا کہتا ہے میرے میزائل کی رسائی آٹھ ہزار میل تک ہے۔ آج کی جدید ترین سائنس بھی قوت کا معیار میزائل کی رینج کو قرار دیے ہوئے ہے۔ اور رباط الخیل سے مراد لاجسٹک ریسورسز یعنی نقل وحرکت کے ذرائع ہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے، خچر اور اونٹ ہوتے تھے، آج طیارے اور بحری جہاز ہیں۔

اب میزائل کی رینج اور لاجسٹک ریسورسز کے ساتھ ایک اور طاقت کا اضافہ ہوگیا ہے، وہ ہے معلومات تک رسائی اور معلومات کا پھیلاؤ۔ یعنی انٹرنیٹ کہ آپ معلومات پر کتنی جلدی اور کتنی مکمل رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ دشمن کے خلاف کتنی طاقت مہیا کرو؟ اس کا معیار یہ بتایا ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم اتنی طاقت جس کے ساتھ تم دشمن کو رعب میں رکھ سکو۔ ارہاب دہشت کو کہتے ہیں، دہشت گردوں کو ارہابیین کہتے ہیں۔ اس آیت کا سادا ترجمہ یہ کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جتنے تمہارے پاس وسائل ہیں سارے خرچ کرو، قوت پیدا کرو، لاجسٹک ریسورسز پیدا کرو، طاقت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو۔ جب طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں تھا، ہم نے حکمرانی کی ہے۔ ہم نے طاقت کا توازن کھو دیا، اب جس کے پاس ہے وہ حکمرانی کر رہا ہے۔

ہماری حکومتوں میں سے دو حکومتوں نے اس طرف توجہ دی ہے۔ عباسیوں نے بالکل ابتدائی درجے میں کہ سائنسی ایجادات اور سائنسی مطالعہ کا آغاز ان کے دور میں ہوا۔ انہوں نے رصد گاہ بنائی۔ رصد گاہ کیا تھی؟ ہمارے ہاں ستاروں وغیرہ کے علوم عقلیات کے دائرے میں تھے، اس کو مشاہدات کے دائرے میں لانے کے لیے سب سے پہلا کام عباسیوں نے کیا ہے۔ اُدھر اندلس میں بنو امیہ تھے، دونوں معاصر تھے، ان دونوں نے اس طرف توجہ دی۔ اس کے بعد ہماری دو حکومتوں نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی ہم مار کھا رہے ہیں۔ نہ خلافتِ عثمانیہ نے اس کو اپنا ایجنڈا بنایا، نہ مغلوں نے بنایا۔ یورپ نے انگڑائی لی اندلس کی وجہ سے، لیکن اس کے متبادل جو ہماری حکومت یورپ کے

ایک حصے ترکی میں بنی، یہ بے خبر رہی، سائنس اور ٹیکنالوجی پر کوئی توجہ نہ دی۔ ادھر مغلوں نے بھی یہی کیا۔

میرا تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ایک دعویٰ ہے اور بے بنیاد نہیں ہے کہ یورپ کو حقوق، عمرانیات اور سماجیات سے اندلس نے متعارف کرایا، سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی اندلس نے متعارف کروایا۔ یہ تو ہمارا کریڈٹ ہے کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا، لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب بنیادیں فراہم کر کے عمارت کی چنائی شروع کرنے کا وقت آیا تو ہم اندلس سے بے دخل ہوگئے۔ ہم اندلس میں ترقی کے راستے پر چل پڑے تھے، لیکن ہم نے سیاسی استحکام کی طرف توجہ نہیں دی۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی استحکام بھی لازمی ہوتا ہے۔ اگر سیاسی استحکام نہ ہو، سلطنت کی بنیادیں قوت کے اعتبار سے کمزور پڑ جائیں تو علم اور ترقی بسا اوقات وبالِ جان بن جاتی ہے۔

جس فلسفے اور نظام کے پیچھے سیاسی اور عسکری قوت نہ ہو، اس کا حال وہی ہوتا ہے جو ہمارا اندلس میں ہوا۔ بنیادیں ہم نے قائم کیں، عمارت یورپ نے کھڑی کر دی۔ اصول ہم نے فراہم کیے، ڈھانچہ انہوں نے بنا لیا۔ آج جو بھی چیز دیکھیں گے اس کے پیچھے اندلس کا غرناطہ اور قرطبہ نظر آئے گا۔ لیکن جب ہم اپنی سیاسی و عسکری قوت برقرار نہیں رکھ سکے تو وہی ہونا تھا جو ہوا۔ بغداد میں ہلاکو خان نے ہماری تباہی کی اور اندلس میں فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا نے کی۔

جب ابو عبداللہ غرناطہ کی پہاڑیوں سے رخصت ہوئے، جلاوطن کر دیے گئے، تو پھر ازابیلا ملکہ تھی اور بادشاہ فرڈیننڈ تھا، ان میاں بیوی نے ہم پر فتح پائی تھی، انہوں نے باقاعدہ نوٹس دے دیا، اعلان کر دیا کہ یا عیسائی ہو جاؤ یا ملک چھوڑ دو ورنہ قتل کر دیں گے۔ یہ مہذب ملکوں کی بنیاد ہے، انہوں نے لاکھوں لوگ قتل کیے، لاکھوں بھاگے، لاکھوں عیسائی ہوئے۔ امریکہ میں جانے والے کالوں کی اور سپینش کی ایک بڑی تعداد مسلمان تھی جو وہاں جا کر تدریجاً عیسائی ہوئے۔ تاریخ کا یہ بھی ایک بڑا عجیب پہلو ہے کہ آج مغرب اور یورپ، جو ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ کہلاتا ہے، ثقافت، کلچر اور سائنس کی ترقی کے نعرے لگاتا ہے، اس سب کی بنیاد اندلس میں امویوں نے رکھی ہے۔ جب انہوں نے اندلس میں حکومت کی تو وہاں یونیورسٹیاں قائم کیں، علمی ادارے اور سائنسی تحقیقات کی لیبارٹریاں قائم کیں، اور اپنے وقت میں ترقیات کے کام کیے جیسے دنیا کی جدید حکومتیں کرتی ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی سب جہالت کا علاقہ تھا جہاں پرانا قبائلی تمدن تھا اور جاہلیت تھی۔ وہاں آہستہ آہستہ اسپین کی یونیورسٹیوں نے علم کی

روشنی پھیلائی اور انہیں ترقی کا راستہ دکھایا۔ مغربی دانشور اعتراف کرتا ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے یہ اندلس کی تعلیم گاہوں، یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں، دانشوروں اور محققین کی خوشہ چینی سے ہمیں ملا ہے۔ میں شہزادہ چارلس کی ایک بات نقل کرنا چاہوں گا۔ شہزادہ چارلس برطانیہ کا ولی عہد ہے، اس نے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ اندلس ہمارا استاد ہے، ہمیں جو علم اور روشنی ملی ہے اندلس سے ملی ہے۔ لیکن ہم مسلمان دوسروں کو روشنی دے کر خود اندھیروں میں بھٹک گئے، یہ ہمارا ایک المیہ ہے۔ بہرحال اندلس میں یہ کشمکش چلتی رہی، بالآخر وہ غالب آگئے اور ایسے غالب آئے کہ ہر چیز تبدیل کردی۔ یہ بڑی تلخ داستانیں ہیں دل کڑھتا ہے لیکن واقف تو ہونا ہی پڑتا ہے۔

میں صرف ایک بات سے اشارہ کرنا چاہوں گا کہ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا ہے، اس سے پہلے امریکہ کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ کولمبس امریکہ دریافت کرنے نہیں نکلا تھا بلکہ وہ ہندوستان کو دریافت کرنے کے لیے سمندر کے راستے سے نکلا تھا، لیکن بحرِ ہند میں وہ دوسری طرف چل پڑا تو اِدھر آنے کی بجائے اُدھر جا نکلا اور اس نے امریکہ دریافت کرلیا۔ آج جو وہاں کے پرانے آثار ملتے ہیں اس کی بنیاد پر تاریخ میں اس بات پر بحث شروع ہوگئی ہے کہ امریکہ مسلمانوں نے دریافت کیا تھا یا عیسائیوں نے؟ عیسائیوں سے پہلے وہاں مسلمان موجود تھے، کولمبس اسی ملکہ ازابیلا کا نمائندہ تھا جس نے سپین کو ہم سے چھینا تھا، اور سپین کی اکثریت کو جبراً عیسائی بنایا تھا یا قتل کردیا تھا یا باہر دھکیل دیا تھا۔ کولمبس ملکہ ازابیلا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ تاریخ میں آج یہ بات پھر متنازعہ ہوگئی ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا تھا؟ یا کولمبس سے پہلے مسلمان اسے دریافت کرچکے تھے؟ آج مغرب کی دانشگاہوں میں اس پر بحث جاری ہے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کولمبس سے پہلے وہاں مسلمان موجود تھے اور وہاں اس زمانے کے مسلمانوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافتِ بنوامیہ، خلافتِ بنوعباس، پھر خانہ جنگی اور طوائف الملوکی، پھر اسپین پر ہم نے آٹھ سو سال حکومت کی، پھر عیسائی وہاں آگئے۔ اگر سپین جائیں تو وہاں آج بھی گلیوں کے نام فاطمہ سٹریٹ، عمر سٹریٹ اور علی روڈ وغیرہ ملیں گے، آج بھی بلڈنگوں اور سڑکوں کے نام صحابہ کرامؓ میں سے کسی بزرگ کے نام پر ہیں، لیکن شاید آپ کو وہاں کوئی عمر یا علی نام کا آدمی نہ ملے، جو اِن ناموں کے ہیں وہ باہر سے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے لندن میں علی سٹریٹ دیکھی ہے، اس میں کئی دفعہ گیا بھی ہوں۔

اس زمانے میں یہ قصہ چلتا رہا۔ میں نے بنو امیہ کے خلافت کے دو دور ذکر کیے ہیں ایک دمشق والا اور دوسرا اُندلس والا۔ بنو عباس کی خلافت کے بھی دو دور ذکر کیے ہیں ایک بغداد والا اور دوسرا مصر والا۔ خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہوا تھا، پھر اس کے بعد سلطنتِ دولتِ فاطمیہ قائم ہوئی۔ پھر ترکی میں تاتاریوں نے خلافت قائم کی جس کے بانی عثمان اول تھے، ان کی نسبت سے خلافتِ عثمانیہ کہلاتی ہے۔ یہ تاتاری اور ترکی تھے لیکن انہوں نے خلافت کا عنوان اختیار کیا تھا۔

خلافتِ عثمانیہ

اللہ تبارک و تعالیٰ بے نیاز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنا ضابطہ اور قانون بیان فرمایا ہے وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (محمد ۳۸) کہ اگر تم میرے احکامات پر چلتے رہو گے تو ٹھیک، ورنہ میں تمہیں ہٹا کر دوسروں کو لے آؤں گا۔ چنانچہ پھر اللہ رب العزت نے خلافت کا نظام سنبھالنے کے لیے ہلاکو خان کی اولاد تاتاری خاندان کو منتخب کیا جو کہ آہستہ آہستہ بڑھتے گئے اور انہوں نے خلافتِ عثمانیہ قائم کی۔ امیر عثمان خان غازی کے والد تھے ارطغرل، ان کے والد سلیمان قبیلے کے سردار تھے۔ ان لوگوں کا سلجوقی حکمرانوں کے ساتھ میل جول تھا، کچھ علاقہ ان کے حوالے ہوا تو سرداری سے بڑھتے بڑھتے ایک چھوٹی سی حکومت بنالی۔ سلطنتِ عثمانیہ ۹۲۳ھ میں قائم ہوئی تھی، امیر عثمان خان غازی نے اس ریاست کے قیام کا اعلان کیا تھا، اس میں یکے بعد دیگرے انتیس خلفاء ہوئے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ ۱۱۸۷ھ تک یعنی اب سے ایک سو سال پہلے ۱۹۲۴ء تک قائم رہی۔

جب سلطنتِ عثمانیہ کا ذکر ہوتا ہے تو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں حضرت عثمانؓ آتے ہیں، حالانکہ عثمانی حضرت عثمانؓ کی اولاد نہیں ہیں، یہ تاتاریوں کی اولاد اور ہلاکو خان کا خاندان ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان میں سے ایک صاحب امیر عثمان خان غازی کو منتخب کیا جنہوں نے حکومت قائم کی اور پھر بڑھتے بڑھتے خلافتِ عثمانیہ وجود میں آئی۔ ایک زمانہ تھا کہ آدھا یورپ، افریقہ اور ایشیا کا بہت بڑا علاقہ سلطنتِ عثمانیہ کے تحت تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے عروج کی کیفیت یہ تھی کہ ترکی، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، لیبیا، الجزائر، مراکش اور تیونس کے عرب علاقہ کے ساتھ ساتھ افریقہ، ایشیا اور مشرقی یورپ بھی خلافتِ عثمانیہ کا دائرہ تھا۔ خلافتِ عثمانیہ جو ترکی میں قائم ہوئی تھی اس نے تین براعظموں پر طویل عرصہ حکومت کی` یہ اپنے دور کی دنیا کی بڑی وسیع حکومت تھی۔

امیر عثمان کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ کا ایک علاقہ تھا، پھر سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ اس

علاقہ کا ذکر احادیث میں آتا ہے اور جو بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت اور عیسائیوں کا مشرقی چرچ تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ قسطنطنیہ کو عیسائیوں میں اس دور میں مذہبی طور پر تقدس کے اعتبار سے وہ حیثیت حاصل تھی جو ہمارے ہاں مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔ ان کا آیا صوفیہ کا گرجا استنبول میں ہے۔ استنبول قسطنطنیہ کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ کئی سلطنتوں کا پایہ تخت اور کئی تہذیبوں کا مرکز رہا ہے۔ میں نے آیا صوفیہ کا گرجا دیکھا ہے، میں جس زمانے میں وہاں گیا تو وہ بند تھا، سنا ہے کہ اب کھل گیا ہے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس کے بعد قسطنطنیہ دارالحکومت بنا۔، اس کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ اور عظیم ہے۔ وہاں خلیفہ کا دربار ''بابِ عالی'' کہلاتا تھا۔ اور یہ اصطلاح اس زمانے میں تین سو سال تک بالکل اسی معنی میں استعمال ہوتی رہی جیسے آج کل وائٹ ہاؤس کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ دنیا پر جو رعب اور دبدبہ آج کل وائٹ ہاؤس کا ہے اور اور اس سے جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بن جاتی ہے، تین سو سال تک یہ حیثیت باب عالی کو حاصل رہی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں بابِ عالی سے رضامندی کی سند لینے کے لیے امید کیا کرتی تھی کہ باب عالی سے کیا حکم صادر ہوا ہے، بابِ عالی میں ہمارے بارے میں کیا مشورہ ہوا ہے۔

میں خلافت عثمانیہ کے اس پہلو پر بھی بات کرنا چاہوں گا کہ مغرب کو ان تین اصطلاحات یعنی خلافت، جہاد اور شریعت سے بہت چڑ ہے، ان کے نزدیک بڑی خطرناک اصطلاحیں ہیں۔ لیکن ہماری تو قوت ہی یہی ہے۔ اسلام کا نظام خلافت ہے، اسلام کی قوت جہاد ہے، اور اسلام کا معاشرہ شریعت ہے۔ مغرب کو یہ بات سمجھ آگئی ہے کہ جب تک یہ تین چیزیں مسلمانوں کے پاس ہیں انہیں زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے مغرب نے ان تین چیزوں کو مٹانے کے لیے دو سو سال اپنا پورا زور لگایا، سیاسی، اقتصادی اور معاشی پروپیگنڈے کیے، ہر حربہ اختیار کیا، لیکن آج مغرب سر پکڑے بیٹھا ہے اور پریشان ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود ہم مسلم سوسائٹی سے خلافت، جہاد اور شریعت کا تصور ختم نہیں کر سکے۔ اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ اس تصور کو نہ ختم کر سکے ہیں اور نہ ختم کر سکیں گے، ان شاء اللہ، کیونکہ یہ زندہ حقیقت ہے اور زندہ حقیقت کو کون ختم کر سکتا ہے؟

خلافت کو ناکام بنانے کے لیے خلافت عثمانیہ کے خلاف مغرب نے مسلسل چالیں چلیں۔ خلافتِ عثمانیہ اپنی کمزوریوں کے باعث تو ختم ہوئی لیکن زیادہ بیرونی سازشیں تھیں۔ ایک انگریز کرنل کا کہنا ہے کہ خلافہ مسلمانوں کی سیاسی قوت کی علامت ہے، جب تک خلیفہ موجود ہے، دنیا میں کہیں بھی کوئی

مسئلہ بن جائے اور خلیفہ اعلان کر دے کہ جہاد فرض ہو گیا ہے تو خلیفہ کا اعلان اتنی قوت رکھتا ہے کہ چاہے وہ استنبول میں بیٹھ کر اعلان کرے، دنیا کے ہر کونے میں مسلمان نوجوانوں کے جذبات مچلنے لگتے ہیں کہ امیر المومنین نے جہاد کا اعلان کر دیا ہے تو ہم جہاد میں کیسے شریک ہوں؟ وہ اس کے لیے کوشش کرنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ خلافت صرف ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ایک طاقت ہے۔ اس لیے آج مغرب کی اور ہماری کشمکش یہی ہے جو بڑی شدید ہے اور شدت پکڑتی جا رہی ہے۔ مغرب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں خلافہ قائم نہیں ہونے دیں گے، شریعہ نافذ نہیں ہونے دیں گے اور جہاد کو تو وہ دہشت گردی کہتے ہیں۔

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ

آج سے سو سال پہلے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تھا، اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس کے پیچھے دو سو سال کی تاریخ ہے اور یورپ کی سازشیں ہیں، جو بڑی مشکل سے بالآخر ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن اس کا فوری اور آخری سبب کیا تھا، میں اس طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ پہلی جنگِ عظیم جو کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک رہی، اس جنگ میں یورپ میں اٹلی، برطانیہ اور روس ایک جانب تھے، جبکہ جرمنی دوسری طرف تھا۔ اصل لڑائی اُن کی تھی۔ اس جنگ میں خلافتِ عثمانیہ جرمنی کے حق میں فریق بن گئی اور جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ جب جرمنی کو شکست ہوئی تو خلافتِ عثمانیہ کو بھی شکست ہو گئی۔ اس شکست کے بعد فاتحین نے سلطنتِ عثمانیہ کے مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اتحادی فوجیں جرمنی میں گھسیں تو ہمارے ملکوں میں بھی گھس گئیں۔ کوئی مصر میں گھس گیا، کوئی فلسطین میں، کوئی الجزائر اور کوئی ترکی میں۔ شکست خوردہ قوموں کا جو حال ہوتا ہے، ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مصر، شام، عراق، فلسطین اور انقرہ جہاں کہیں جس کو موقع ملا وہ گھس گیا۔ کچھ حصہ فرانس نے، کچھ حصہ برطانیہ نے اور کچھ اٹلی نے سنبھال لیا۔ برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا، مصر فرانس کے حصے میں آ گیا۔ یورپ کی فوجیں قبضہ کرنے کے لیے استنبول میں داخل ہوئیں۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے تقسیم کر دیں گے۔

اسرائیل کے قیام کا منصوبہ

ایک مستقل پس منظر ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری کے لیے برطانیہ نے یہودیوں سے

وعدہ کیا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں فلسطین میں یہود کی کوئی زیادہ آبادی نہیں تھی۔ یہودی صرف ویزے پر آتے، اپنے مقدس مقامات کی زیارت کرتے اور چلے جاتے۔ یہودیوں کو فلسطین کی زمین خریدنے، وہاں مکان لینے اور کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہودیوں نے اس پر بہت زور لگایا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں خلیفہ عبدالحمید ثانی کے پاس بہت وفد گئے کہ ہمیں فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ زمین خرید خرید کر ہم وہاں اپنی آبادی بنائیں گے اور پھر بیت المقدس پر قبضہ کریں گے۔ سلطان عبدالحمید نے انکار کر دیا۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، بہرحال جنگِ عظیم اول میں ترکی اور خلافتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد طاقت تقسیم ہو گئی، فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا اور یہودیوں سے وعدہ کیا کہ یہ ملک تمہیں دلوائیں گے۔ وہ معاہدہ اعلان بالفور کہلاتا ہے۔ بالفور برطانیہ کے اس وزیر خارجہ کا نام ہے جس نے یہودی عالمی تنظیم سے یہ معاہدہ کیا کہ تم ہماری جنگ کے خرچے ادا کرو کیونکہ ہمارا کافی بڑا نقصان ہوا ہے تو پھر ہم فلسطین تمہیں دلوائیں گے۔ چنانچہ جب برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا تو وہاں یہودیوں کی آبادکاری کا اعلان کیا اور دنیا بھر کے یہودیوں کو اجازت دے دی کہ وہ آکر زمین خریدیں، مکان بنائیں اور کاروبار کریں۔ یوں دنیا بھر سے یہودی فلسطین میں آکر آباد ہونا شروع ہو گئے۔

یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اس وقت فلسطین کے مفتی اعظم الحاج سید امین الحسینی تھے۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں پر فلسطین کی زمین بیچنا حرام ہے کیونکہ وہ زمین خرید کر یہاں آباد ہونا چاہتے ہیں اور پھر بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ پیسے یہودیوں کے پاس تب بھی تھے، اب بھی بہت ہیں۔ اس لیے فلسطین کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی نے اعلان کیا کہ فلسطین کی زمین یہودیوں پر بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن فلسطینیوں نے اس فتوے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ صرف اتنا فرق پڑا کہ ایک لاکھ کی زمین دو لاکھ کی ہو گئی اور دو لاکھ کی زمین چار لاکھ کی ہو گئی۔ زمین کی قیمتیں کئی گنا بڑھ گئیں تو فلسطینیوں نے اپنی زمینیں اور مکانات کئی گنا زیادہ قیمت وصول کر کے بیچ ڈالے۔ فلسطین کا ایک حصہ یہودیوں نے برطانوی دور میں خرید کر اپنا وطن بنایا، اور آہستہ آہستہ اپنی آبادی بڑھا کر انہوں نے وہاں اسرائیل کے قیام کا راستہ ہموار کیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس فتوے کی تائید ہمارے برصغیر کے بزرگوں نے بھی کی تھی۔ مثلاً حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ۔ حضرت تھانویؒ کی کتاب بوادر النوادر میں ایک مستقل رسالہ ہے جو انہوں نے فلسطین کی

زمین یہودیوں کو بیچنے کے عدمِ جواز پر مفتی اعظم فلسطین کی حمایت میں لکھا تھا۔ اس میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ہمارے ساتھ یہ المیہ بھی گزرا کہ ہم نے خود اپنی زمینیں یہودیوں پر بیچیں اور یہودیوں کو آباد کاری کا موقع دیا۔

میں عرض کر رہا ہوں کہ خلافت کیسے ختم ہوئی۔ اتحادیوں نے ترکی پر قبضہ کر لیا تھا۔ فوجیں استنبول میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ سب شکست خوردہ تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک اس زمانے میں ترکی کا بڑا قومی لیڈر تھا، اس نے ایک نیا نعرہ لگایا کہ ترکی ترکیوں کا ہے، یہاں ترک حکومت کریں گے، ہم ترکی کی زمین کسی اور کے حوالے نہیں کریں گے، وہ اس کے لیے کھڑا ہو گیا اور اس نے جنگ لڑی کہ ترکی میں غیر ملکی فوجیں نہیں ہوں گی۔ اس نے کہا کہ باقی جو ہوا سو ہوا، خلافت وغیرہ کو چھوڑو، لیکن ترکی کو ہم سنبھالیں گے۔ وہ ترکی کی آزادی کے لیے کھڑا ہو گیا اور اس نے اتحادی فوجوں سے باقاعدہ جنگ لڑی۔ اس کا ایک ڈسکریڈٹ ہے کہ اس نے خلافت اور شریعت کا خاتمہ کیا، لیکن اس کا ایک کریڈٹ بھی ہے کہ ترکی کو یورپین ملکوں کے درمیان تقسیم ہونے سے بچا لیا۔

ترکی والے اس کو ایسے ہی اپنا قائد نہیں مانتے، آج بھی اس کو اپنا باپ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی اس نے بچایا تھا، خود مختاری کی جنگ لڑی اور ترکی کی حفاظت کا نعرہ لگایا۔ پھر مذاکرات کی میز بچھی۔ مشرقی یورپ کا شہر لوزان ہے، وہاں جنگوں کے بعد ان کے مذاکرات ہوئے۔ جنگوں کے فیصلے بھی مذاکرات میں ہوتے ہیں اور جنگوں کے نتائج کے فیصلے بھی مذاکرات کی میز پر ہوتے ہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ برطانیہ نے کہا کہ ہم فاتح ہیں، ہم ترکی کو بھی تقسیم کریں گے۔ وہاں مصطفیٰ کمال کا مطالبہ یہ تھا کہ ترکی کی حدود میں ترکی کی خود مختاری آپ کو تسلیم کرنا ہوگی۔ اور ترکی اتنی لڑائی لڑ چکا تھا کہ اب ان کے لیے معاہدہ کرنا مجبوری بن گیا تھا۔ چنانچہ لوزان میں ان کی آپس میں شرائط طے ہوئیں۔ مغربی قوتوں نے یہ شرط لگا دی کہ ہم ترکی کی خود مختاری تسلیم کریں گے، اپنی فوجیں واپس بلائیں گے، لیکن اس شرط پر کہ تم خلافت کے ختم کرنے اور شریعت کے منسوخ ہونے کا اعلان کرو۔ کمال پاشا ویسے خود خلافت ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا، برائے نام خلافت جس طرح عباسیوں کی مصر میں تھی، ویسے وہ بحال رکھنا چاہتا تھا کہ خلیفہ کا لفظ اور تقدس قائم رہے، ہم اس کے سائے تلے اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن مغربی قوتوں نے ترکی کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کرنے کے لیے تین شرطیں لگا دیں:

1. پہلی یہ کہ خلافت ختم کرو اور اعلان کرو کہ آئندہ خلافت قائم نہیں ہوگی۔

2. دوسری یہ کہ شریعت کا قانون منسوخ کر کے اٹلی کا قانون نافذ کرو اور اعلان کرو کہ آئندہ ہماری حدود میں شریعت نافذ نہیں ہوگی۔

3. ترکی خلافتِ عثمانیہ کے دور کے کسی مقبوضہ علاقہ پر دعویٰ نہیں کرے گا۔

ان کے سامنے یہ تین شرطیں رکھی گئیں، ترکی کی خود مختاری تسلیم کرنے اور ترکی سے غیر ملکی فوجیں نکلوانے کے لیے، جو استنبول میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان شرطوں پر مصطفی کمال اتاترک نے خلافت بھی ختم کر دی اور شریعت بھی منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا اور اٹلی کا قانون نافذ کیا۔ اس طرح مغربی ملکوں نے جمہوریہ ترکی کو ایک آزاد اور سیکولر ریاست تسلیم کیا اور اپنی فوجیں واپس بلائیں۔

۱۹۲۴ء میں ترکی نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ جو جلاوطن ہوئے وہ سلطان عبدالوحید خان اور ان کے بیٹے سلطان عبدالمجید خان تھے۔ ان کو بحری جہاز پر بٹھا کر جلاوطن کر دیا گیا تھا اور وہ سمندر پار چلے گئے تھے۔ ایک دور میں براعظموں پر حکومت کرنے والی خلافتِ عثمانیہ کا یہ حال ہوا جو تاریخ کا ایک المیہ ہے۔

خلافت اور شریعت کے خاتمہ کا عالمگیر معاہدہ؟

یہ تو ترکی کے ساتھ ہوا۔ ادھر انہوں نے نئی منطق اختیار کی۔ مغرب نے یہ اعلان کیا کہ ہم دنیا کے کسی خطے میں شریعہ نافذ نہیں ہونے دیں گے اور خلافہ قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اس اعلان کی وجہ اس نے یہ ذکر کی کہ لوزان میں جو ہمارے ساتھ معاہدہ کیا گیا تھا وہ معاہدہ عالمِ اسلام کی طرف سے تھا۔ مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو خلافت کے نمائندے تھے اور خلافت عالمی تھی، انہوں نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ خلافت ختم کریں گے اور دوبارہ قائم نہیں کریں گے، شریعہ منسوخ کریں گے اور دوبارہ نافذ نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ صرف ترکی کی طرف سے نہیں تھا بلکہ خلافتِ عثمانیہ کے نمائندے کے طور پر عالم اسلام کی طرف سے معاہدہ تھا۔ اس لیے ہم دنیا کے کسی خطے میں نہ خلافہ قائم ہونے دیں گے اور نہ شریعہ نافذ ہونے دیں گے۔

اسی بنیاد پر مسلمان ملکوں میں جہاں نفاذِ اسلام کی بات ہوتی ہے یا شریعہ نافذ کرنے کی بات ہوتی ہے تو سارا مغرب اس کے مخالف کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ ہمیں جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں یا جو قدم قدم پر بریکر پیش آتے ہیں بسا اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیں نظر نہیں آتا لیکن اچھل کر ایسے جکڑے جاتے ہیں کہ ہمیں پتا نہیں چلتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا

ہے۔ اس لیے یہ پہلو بھی ہمیں سامنے رکھنا چاہیے۔ جب ہم بین الاقوامی معاملات پر بات کرتے ہیں تو ظاہری منظر سے پیچھے کے عوامل بھی دیکھنے چاہئیں کہ پیچھے کیا رکاوٹ ہے۔ یہ معاہدہ لوزان اب تک ہمارے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔

چند سال پہلے برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر، جو کہ موجودہ مغربی مہم اور عالمِ اسلام کے خلاف مغربی جنگ کا بہت بڑا فکری لیڈر رہے، چار سال برطانیہ کا وزیراعظم رہا ہے۔ عالمِ اسلام کے خلاف مغرب کی تحریک کو جو اس وقت پیچھے بیٹھ کر کمان کر رہے ہیں وہ بش، ٹونی بلیئر اور امریکہ کا سابق نائب صدر ڈک چینی ہیں۔ جب ٹونی بلیئر نے وزارت عظمی چھوڑی تو اس نے اپنی پارٹی کی سالانہ کانگرس میں پالیسی تقریر کی جو کہ بڑی دلچسپ تقریر ہے اور ہمارے ہر دینی تحریک کے کارکن کے علم میں ہونی چاہیے۔ جب ہم نفاذِ اسلام اور نفاذِ شریعت کی بات کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں رکاوٹ کون ہے اور کہاں ہے۔ اس میں ٹونی بلیئر کی وہ تقریر بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اس کی وجہ بالکل صاف واضح الفاظ میں ذکر کی کہ ہم سے خلیفہ کے نمائندوں نے معاہدہ کیا تھا کہ خلافت دوبارہ قائم نہیں ہوگی اور شریعت دوبارہ نافذ نہیں ہوگی۔ ہمارے ساتھ یہ معاہدہ مصطفی کمال کا نہیں امتِ مسلمہ کا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ہم دنیا میں نہ کہیں خلافت بننے دیں گے اور نہ کہیں شریعت نافذ ہونے دیں گے۔ اوباما نے بھی یہی کہا کہ نہیں ہونے دیں گے، اس کی یہی وجہ ہے۔ یوں معاہدہ لوزان کے نتیجے میں ترکی کو تو خود مختاری مل گئی، لیکن ہم ابھی تک قابو میں آئے ہوئے ہیں اور خدا جانے کب تک قابو میں رہیں گے۔

میں یہ بات گذشتہ تیس سال سے لکھتا آ رہا ہوں کہ معاہدہ لوزان ہماری گردن پر گھٹنا رکھ کر گن پوائنٹ پر کروایا گیا تھا، مغرب کی فوجیں ترکی میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ یہ فوجیں تب نکلیں گی جب آپ اس معاہدہ پر دستخط کریں گے۔ میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ معاہدہ لوزان مصطفی کمال اتاترک کی مرضی سے نہیں ہوا تھا۔ یہ بات پچھلے سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے ترک صدر طیب اردگان نے کہی ہے کہ ہم سے معاہدہ لوزان گن پوائنٹ پر ہوا تھا اس میں ہماری مرضی شامل نہیں تھی، طاقت کے بل پر ہم سے معاہدہ کروایا گیا تھا۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ ترکی کے صدر کی جنرل اسمبلی کی وہ تقریر میں چار پانچ دن تلاش کرتا رہا لیکن پاکستان کے کسی اخبار میں تلاش کر کے بھی نہیں ملی۔ دلی کے سہ روزہ دعوت نے پوری تقریر چھاپی ہے، اس کے حوالے سے میں نے کالم لکھا کہ میں جو

تیس سال سے کہتا آرہا ہوں طیب اردگان نے بھی وہی کہا ہے۔

ہمیں یہ مغالطہ بھی دور کرلینا چاہیے کہ معاہدہ لوزان کی مدت ۲۰۲۴ء میں ختم ہو رہی ہے تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ کچھ نہیں ہوگا، ہم ویسے ہی خوش فہمی میں ہیں۔ اس سے صرف یہ فرق پڑے گا کہ یورپی یونین معاہدے کی پچاس یا سو سال کی توسیع کا ایک ریگولیشن کرے گی، صدر طیب اردگان ہوا تو نہیں مانے گا، کوئی دوسرا ہوا تو مان لے گا، اس کے سوا کوئی فرق نہیں پڑے گا، میرا ذاتی تاثر یہ ہے۔

یہ آج خلافت اور شریعت کے حوالے سے ہماری کشمکش ہے۔ دنیا میں خلافت کی بیسیوں تحریکیں ہیں۔ ہم بھی خلافت کی بات کرتے ہیں لیکن عالمی سطح پر کوئی ایسا فورم جو خلافت اور شریعت کی بات کرے، ہمارا کوئی ایسا فورم نہیں ہے۔ علاقائی تنظیمیں ہیں لیکن کوئی ایسا فورم نہیں ہے جو میز پر بیٹھ کر ٹونی بلیئر اور اوباما سے خلافت کی بات کر سکے۔ جب تک ہم عالمی سطح پر اس لیول پر نہیں آئیں گے بات آگے نہیں بڑھے گی، علاقائی سطح پر ممکن ہے کہیں کوئی امارت قائم ہو جائے۔ لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس کے راستے کہاں سے اور کیسے نکالیں گے؟ یہ ہماری قیادت، ہماری سیاست اور ہماری فراست کا امتحان ہے، ہم ان شاء اللہ سرخرو ہوں گے لیکن وقت لگے گا۔

ایک امید کی کرن نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ پوری کردیں۔ افغانستان سے امریکہ کے جانے کے بعد اگر طالبان کی حکومت دوبارہ قائم ہوتی ہے، جو بظاہر بہت مشکل دکھائی دیتی ہے، لیکن میری خواہش اور دعا ہے کہ ایسا ہو۔ اگر وہ امارتِ اسلامیہ کا دوبارہ اَحیا کر سکیں تو شاید آئندہ کے لیے خلافت کی بنیاد بن جائے۔ اگر وہ امارت اسلامیہ نئی خانہ جنگی سے بچ جاتی ہے تو شاید دنیا میں کچھ عرصہ کے بعد خلافتِ عثمانیہ کا نقشِ اول بن سکے، ورنہ بظاہر حالات مایوس کن تو نہیں البتہ پریشان کن ہیں۔ افغانستان میں طالبان سمجھداری سے کام لے رہے ہیں کہ خلافت کا لفظ نہیں بول رہے اور وہ بہت ٹھیک کر رہے ہیں۔ طالبان دھیمے دھیمے ٹھنڈے ٹھنڈے چل رہے ہیں، مظلوم اور محصور ہیں۔ پچھلے دنوں میری ان کے بعض ذمہ دار حضرات سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اس وقت شعبِ ابی طالب میں ہیں، آپ کو بھوک برداشت کرنی پڑے گی۔ اگر چند سال افغان قوم بھوک برداشت کرلے تو مجھ فقیر کی پیشگوئی ہے کہ آئندہ خطے کی قیادت آپ کریں گے۔ ہم اہلِ پاکستان کو انہیں سپورٹ کرنا چاہیے، نعروں سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ضرورت یہ ہے کہ ان کو اس قابل بنایا جائے کہ ہماری بنیاد بنے۔ جب تک دنیا میں ہماری کوئی آزاد بنیاد نہیں بنے گی تب تک ہم باتیں ہی

کرتے رہیں گے۔ ابھی پچھلے دنوں لاہور میں میٹنگ تھی اس میں بعض علماء کہہ رہے تھے کہ ہم نے افغانستان جانا ہے۔ میں نے ان سے کہا خدا کے لیے طالبان کو آرام سے حکومت کرنے دو، ان کے لیے مسائل نہ کھڑے کرو۔

برصغیر کی تحریکِ خلافت

تحریکِ خلافت جنوبی ایشیا میں پہلی سیاسی تحریک تھی جس نے پورے برصغیر کو متاثر کیا۔ پہلے یہ تحریک علاقائی تھی لیکن پھر اس نے کلکتہ سے پشاور تک پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا اور ایک منظم فورم مہیا کر دیا۔ تحریکِ خلافت کی قیادت مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ کر رہے تھے جو کہ علی برادران کہلاتے ہیں، یہ پورا خاندان تحریکِ خلافت کا لیڈر تھا۔ اور تحریکِ خلافت پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہندو مسلمان دونوں اکٹھے تھے، اس کے لیڈروں میں مولانا محمد علی جوہر بھی بڑے لیڈر تھے اور مہاتما گاندھی بھی بڑے لیڈر تھے۔ خلافت کی حمایت میں گاندھی جی کی بھی بڑی زبردست تقریریں ہیں، لیکن برصغیر کی نہیں، ترکی کی خلافت کی حمایت میں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ خلافتِ عثمانیہ قائم رہنی چاہیے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے جب مالٹا جزیرہ سے رہائی کے بعد یہاں آکر حالات کا جائزہ لیا کہ اب عسکری تحریک کے حالات نہیں ہیں، تو آنے کے بعد پہلا اعلان یہ کیا کہ آج کے بعد ہم عدمِ تشدد پر تحریک چلائیں گے۔ یعنی سیاسی جلسہ، جلوس، مظاہرے، مطالبے اور قوت کا مجتمع کرنا۔ اس کے ساتھ ترکِ موالات ہماری تحریک کی بنیاد ہوگی، یعنی ہم ہتھیار نہیں اٹھائیں گے لیکن حکومت سے تعاون بھی نہیں کریں گے۔ یہ نئی سیاسی تحریک کی بنیاد تھی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان تشریف لانے کے بعد ۱۹۲۰ء میں ایک تو تحریک کا رخ عسکریت سے عدمِ تشدد کی طرف موڑا۔ اور دوسرا یہ کیا کہ دیوبند اور علی گڑھ میں مصالحت کی بات کی کہ دونوں کو اکٹھا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے شیخ الہندؒ خود علی گڑھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ نوجوان بھی مخلص ہیں، ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی وطن کی آزادی چاہتے ہیں، لہٰذا ان سے بھی استفادہ کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ بھی تعاون کرنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اس فکر کے نتیجے میں علی گڑھ سے جو قیادت آئی وہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر مختار انصاری اور حکیم اجمل خان رحمہم اللہ تعالیٰ یہ سب علی گڑھ کے لوگ ہیں، ان میں سے کوئی بھی دیوبند کا آدمی نہیں ہے۔ یہ شیخ

الہندؒ کی اس پیش قدمی پر ادھر سے آئے اور پھر تحریکِ آزادی کی قیادت کا حصہ نہیں بلکہ مرکز بن گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند اور علی گڑھ کی مصالحت کی بات کی اور پھر ایک نیا جامعہ ملیہ وجود میں آیا جو پہلے علی گڑھ میں کیمپوں اور خیموں میں قائم ہوا، پھر وہاں سے دہلی منتقل ہوا۔ اب بھی جامعہ ملیہ انڈیا کے بڑے تعلیمی اداروں میں ہے، اس کی بنیاد ان دونوں کے ملاپ پر تھی جس سے ایک نئی صورتحال پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں تحریکِ خلافت نے جنم لیا۔ تحریکِ خلافت برصغیر کی تحریکات میں بہت بڑی تحریک تھی جس کے اثرات آج تک محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ پہلی سیاسی تحریک تھی۔ اس سے پہلے عسکری تحریکیں تھیں اور آزادی کے لیے عسکری گروپ تھے، سندھ، بلوچستان اور پنجاب میں بھی آزادی کے لیے مسلح جنگیں ہوئیں۔ تحریکِ خلافت عدمِ تشدد پر مبنی پولیٹیکل تحریک تھی کہ ہم نے ہتھیار نہیں اٹھانے اور جلوس، جلسے، رائے عامہ، سول سوسائٹی اور سٹریٹ پاور کے ذریعے دباؤ ڈال کر باتیں منوانی ہیں۔ یہ برصغیر کی اس طرز کی پہلی تحریک تھی۔ اس تحریک میں پورا برصغیر گونج اٹھا۔ بڑے جذبے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ لوگ سڑکوں پر آتے تھے، جلوس نکالے گئے، گرفتاریاں ہوئیں، تشدد ہوا اور وہ سب کچھ ہوا جو تحریکوں میں ہوتا ہے، لیکن اس کی بنیاد عدمِ تشدد پر تھی کہ ہم نے مقابلے میں ہتھیار نہیں اٹھانا۔

اس تحریک کی قیادت علی گڑھ اور دیوبند دونوں نے مل کر کی ہے۔ حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، چوہدری افضل حق یہ سارے علی گڑھ کے فضلاء ہیں، ان میں سے باقاعدہ مولانا کوئی بھی نہیں ہے۔ جبکہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مفتی محمد کفایت اللہؒ اور دوسرے علماء دیوبند کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ اس تحریک کے لیڈر تھے۔ مولانا ظفر علی خان بھی تحریک خلافت کے بڑے لیڈروں میں سے تھے، یہ وزیر آباد کے تھے، مسلکاً اہلِ حدیث اور تعلیماً علی گڑھی تھے، بہت بڑی شخصیت تھے۔ باغیوں کا پہلا اخبار روزنامہ زمیندار انہی کا ہے۔ ایک زمانے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ''الہلال'' اور مولانا ظفر علی خان کا ''زمیندار'' آگ برسانے والے پرچے سمجھے جاتے تھے۔ روزنامہ زمیندار کئی دفعہ ضبط ہوا، کئی دفعہ گرفتاریاں ہوئیں، اور کئی دفعہ ضمانتیں لی گئیں لیکن مولانا ظفر علی خان کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ شاعر بھی تھے، خطیب بھی تھے، اس زمانے کے بی اے تھے۔ ایک دن وزیر آباد میں مولانا ظفر علی خان کی یاد میں جلسہ تھا۔ میں نے کہا دیکھو تم کہتے ہو کہ علماء بڑے تنگ دل ہوتے ہیں، دوسرے کو برداشت نہیں

کرتے، تم نے مسٹر بھیجا تھا ہم نے مولانا ظفر علی خان بنا کر آگے کیا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے لیکن ہم نے مولانا کہہ کر سر پر بٹھایا۔ اسی طرح مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو بھی سر پر بٹھایا اور ان کی قیادت میں کام کیا، جبکہ تم علماء کو تنگ نظر کہتے ہو۔ ان میں صرف مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور ایک دو اور بزرگ علماء کے کیمپ سے تھے لیکن اس کی عمومی قیادت علی گڑھ کے اس گروپ نے کی۔

چنانچہ تحریکِ خلافت میں سب سے بڑا نام مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کا آتا ہے۔ اس خاندان کی تیسری شخصیت جس نے قیادت کی، وہ مولانا جوہر کی اماں ہیں۔ جب یہ دونوں بھائی گرفتار ہوئے تو ان کی اماں میدان میں آگئیں، وہ جلسوں سے خطاب کیا کرتی تھیں، وہ بڑے زبردست جلسے ہوا کرتے تھے، اس زمانے کا بڑا مشہور ترانہ ہے ۔

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ اس زمانے کا سب سے زیادہ مقبول ترانہ تھا۔ یوں اماں نے آکر بیٹوں کی جگہ سنبھالی اور پورے ملک میں دورے کیے، تقریریں کیں اور لوگوں کو بھڑکایا۔

تحریکِ خلافت ہندوستان میں خلافت قائم کرنے کی تحریک نہیں تھی بلکہ ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کی حمایت میں اس کو بچانے کی تحریک تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ ترکی کو ناکامی ہوگئی تھی، برطانیہ اور فرانس کی متحدہ فوجیں جیسے جرمنی میں داخل ہوئی تھیں ترکی کے مقبوضات میں بھی داخل ہو گئیں، فلسطین اور مصر میں داخل ہوگئی تھیں، علاقوں کو تقسیم کر لیا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ ان کا پرانا صدیوں سے غصہ چل رہا تھا اس لیے ان کا پروگرام یہ تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے بانٹ لیں اور اس کا وجود ختم کر دیں۔ استنبول اور انقرہ میں متحدہ فوجیں داخل ہوگئی تھیں اور ترکی قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت چونکہ برطانیہ لیڈر تھا اور ہم بھی سلطنتِ برطانیہ کا حصہ تھے، تو ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی لیڈروں نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ خلافتِ عثمانیہ کو ختم نہ کیا جائے بلکہ قائم رہنے دیا جائے۔ ہم خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے حق میں نہیں ہیں۔

تحریکِ خلافت ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ، اس کی بقا اور اس کو خاتمے سے بچانے کے لیے ہندوستان میں چلائی گئی تھی۔ تاکہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور برطانوی حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ ترکی کی خلافت کے خاتمے کی ترتیب اور تشکیل واپس لے۔ یورپ تلا ہوا تھا کہ خلافت کو ختم

کرنا ہے اور عملاً اس نے ختم کی۔ تحریکِ خلافت میں گرفتاریاں، جلسے اور جلوس بہت کچھ ہوا، لیکن خلافت نہیں بچی۔ کیونکہ خلافت ترکی کا مسئلہ تھا، یہاں کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں، جب ترکی خود خلافت سے دستبردار ہو گیا تو وہ تحریک ختم ہو گئی۔

آج مصطفی کمال اتاترک کے بارے میں ایک طرف شدید نفرت پائی جاتی ہے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی وجہ سے، تو دوسری طرف شدید محبت پائی جاتی ہے کہ اس نے ترکی کو بچا لیا تھا۔ وہ ترک قومیت کے نام پر کھڑا ہو گیا، اس نے متحدہ فوجوں اور یونانی فوجوں سے باقاعدہ لڑائی لڑی۔ وہ اس بات پر جم گیا کہ ہم ترکی نہیں دیں گے، ترکی کی ریاست رہے گی، باقی جو آپ کہتے ہیں وہ ہم مان لیتے ہیں۔ اس پر عصمت انونو، مصطفی کمال اتاترک کے بعد ترکی کا دوسرا بڑا لیڈر تھا، یہ دونوں ڈٹ گئے کہ ہم ترکی کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اس پر متحدہ فوجوں سے برطانیہ، فرانس وغیرہ سے مذاکرات وغیرہ چلتے رہے۔ متحدہ قوتوں کا موقف یہ تھا کہ اگر خلافت کا ٹائٹل قائم رہتا ہے تو کل کسی وقت ترکی یہ کہہ سکتا ہے کہ مصر بھی ہمارا حصہ ہے، الجزائر اور فلسطین بھی ہمارا حصہ ہے، اس لیے خلافت کا ٹائٹل تو ختم کرنا ہو گا تاکہ ترکی کسی ملک اور کسی علاقے کا دعویدار نہ ہو۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں لوزان پیکٹ میں یورپ کی فوجوں کے انخلا کے لیے ترکی کو لکھ کر دینا پڑا کہ ہم خلافت ختم کریں گے، خلیفہ کو جلاوطن کریں گے، شریعت کا قانون ختم کر کے اٹلی کا قانون لائیں گے۔ یہاں تک بھی شاید گزارا ہو جاتا، لیکن ان کی یہ بھی شرط تھی کہ ترکی لکھ کر دے کہ آئندہ بھی ہمیشہ کے لیے کبھی ہم خلافت کا نام نہیں لیں گے اور شریعت کا نام نہیں لیں گے۔ چنانچہ پورے ملک میں عدالتوں سے شریعت کے قوانین منسوخ کر کے اٹلی کے قانون لے آئے، مساجد اور تکیے (خانقاہوں) اور مدارس و مراکز پر تالے لگ گئے، عربی زبان منسوخ ہو گئی حتیٰ کہ قرآن پاک عربی زبان میں پڑھنا ممنوع قرار پایا، اذان بھی ترکی زبان میں دے سکتے تھے عربی زبان میں نہیں دے سکتے تھے۔ بہت کچھ ہوا سو ہوا۔ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔

جبکہ ہمارے ہاں خلافتِ عثمانیہ کی حمایت میں تحریکِ خلافت چلتی رہی۔ مختلف شہروں میں جلسے جلوس ہوتے رہے۔ لیکن چونکہ وہاں خلافت ختم ہو گئی تھی اس لیے یہاں تحریک جاری نہ رہ سکی۔ تاہم تحریکِ خلافت کا ایک بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہمیں سیاسی جدوجہد کرنے کا طریقہ آ گیا۔ میں تحریکِ خلافت کو برصغیر کی سیاسی تحریکاتِ آزادی کی نرسری کہا کرتا ہوں۔ اس کے بعد جتنی جماعتیں بنی ہیں ان کے لیے ساری کھیپ یہاں سے ملی۔ مسلم لیگ کو بھی قیادت یہاں سے ملی، کانگریس اور خاکسار تحریک کو

بھی یہاں سے ملی، جمعیت علماء ہند میں بڑی کھیپ تھی جنہوں نے تحریکِ خلافت میں تربیت حاصل کی اور پھر جماعتوں میں آکر کام کیا۔

اسی تحریک کی ایک بڑی پیداوار ہے جس کا نام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہے۔ جس سال یہ تحریکِ خلافت چلی ہے حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ خیر المدارس جالندھر میں موقوف علیہ کے طالب علم تھے۔ آپ جلسوں میں تقریروں کے لیے نکلے اور خطابت کے میدان میں آئے۔ ان کی خطابت اور صلاحیت کو دیکھ کر لوگوں نے انہیں ہاتھوں اور سروں پر اٹھا لیا۔ اور پھر آپ دورۂ حدیث نہیں کر سکے، بلکہ آپ خطابت کے میدان میں بڑھے اور بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ اپنے وقت میں ایشیا کے سب سے بڑا خطیب کہلائے۔ ایشیا میں اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید پڑھنے کا ذوق بھی دیا تھا، شعروشاعری کا ذوق بھی تھا۔ انہوں نے موقوف علیہ تک کتابیں پڑھی تھیں لیکن اس زمانے کی موقوف علیہ تک کتابیں آج کے بڑے بڑے متخصصین سے زیادہ علم دیتی تھیں۔ دورۂ حدیث نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عالم نہیں تھے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بڑے عالم تھے، وہ بھی تحریکِ خلافت کا ثمرہ ہے۔

مجلسِ احرارِ اسلام کیسے بنی؟ جب تحریکِ خلافت ناکام ہوگئی یعنی ترکی میں خلافت ختم ہوگئی اور یہاں تحریک ختم ہوگئی تو اس وقت پنجاب سب سے زیادہ متحرک تھا۔ پنجاب کی تحریکِ خلافت کے لیڈروں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ تحریک ختم ہوگئی ہے لیکن ہم تو موجود ہیں۔ مولانا داؤد احمد غزنویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چوہدری افضل حق مرحوم جو کہ بہت بڑے مفکر اور سیاسی مدبر تھے وہ پہلے انگریز پولیس کے انسپکٹر تھے، شاہ جی کی تقریر سنی اور استعفیٰ دے کر تحریک میں آگئے تھے اور پھر مفکرِ احرار کہلائے۔ ان اکابر نے فیصلہ کیا کہ اب ہم نئے نام سے کام شروع کرتے ہیں، تو پنجاب میں جو تحریکِ خلافت بنی تھی اس نے "احرارِ اسلام" کا نام اختیار کر کے اپنی جماعت منظم کی اور پورے برصغیر میں پشاور سے کلکتہ تک انہوں نے آزادی کی تحریک اور جوش پیدا کیا۔

خلافتِ عثمانیہ جیسی کیسی بھی تھی، کمزور تھی، لیکن عنوان اور تعارف بہت مضبوط تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک ذکر کرتا ہوں۔ اس وقت دنیا میں عالمِ اسلام کی جو موجودہ صورتحال ہے، ہماری کسمپرسی اور مشکلات کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری کوئی مرکزیت نہیں ہے

جو عالم اسلام کی نمائندہ کے طور پر بات کرسکے۔ اس پر مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو کا ایک جملہ یاد آیا۔ میں کسی دینی قائد کی بات نہیں کررہا، جب ان سے ان کے دوسرے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں عالمِ اسلام کے مسائل پر انٹرویو لیا گیا، تو اس کا ایک جملہ مجھے نہیں بھولتا۔ اس وقت مشرقی یورپ میں بوسنیا اور سربیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، ہر مسلمان افسردہ تھا۔ اس پر ہماری وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے عالمِ اسلام کے مصائب اور مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے بڑی حسرت سے یہ جملہ کہا تھا کہ ''اب تو کوئی اوتومن ایمپائر بھی نہیں ہے جس سے ہم اپنا دکھ بیان کرسکیں کہ ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے''۔ اوتومن ایمپائر سے مراد خلافتِ عثمانیہ ہے۔ یہ حسرت بھرا جملہ ہمیں اندازہ کراسکتا ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کی اہمیت کیا تھی؟ خلافت عثمانیہ ہماری مرکزیت تھی اور جب تک ہماری کوئی مرکزیت قائم نہیں ہوتی ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے، ہم اسی طرح بکھرے رہیں گے اور اسی طرح مسائل کا شکار رہیں گے۔

قیامِ خلافت کا فریضہ اور موجودہ جدوجہد

جہاں تک خلافت کا تعلق ہے، اس کا قیام فقہائے اسلام کے ارشادات کی روشنی میں عالمِ اسلام کے اجتماعی دینی فرائض میں سے ہے۔ شرعاً ہم پر فرض ہے کہ ہم خلافت قائم کریں اور دنیا میں خلافت کا وجود ہو۔ یہ بات آپ کے علم میں ہونی چاہیے کہ خلافت کے نام سے دنیا میں ایک مسلمان ملک موجود ہے جس کے سربراہ خلافت کے نام پر حکومت کرتے ہیں اور سرکاری طور پر امیرالمومنین کہلاتے ہیں، وہ ملک مراکش ہے، جس کی حکومت اس وقت بھی اپنے دستور کے اعتبار سے خلافت کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ امیرالمومنین نہیں چاہئیں، عالمی خلافت جو عالمِ اسلام کے مسائل کی نمائندگی کرے، اس کی ضرورت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' ان کی اس موضوع پر مستقل کتاب ہے۔ باقی فقہاء بھی یہی بات کہتے ہیں لیکن شاہ صاحبؒ کا انداز ذرا مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ خلافت کا قیام امت کے اجتماعی فرائض میں سے ہے اور یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر دنیا کے کسی حصے میں شرائط کے مطابق خلافتِ اسلامیہ موجود ہے جو عالمِ اسلام کے مسائل کی نمائندگی کرتی ہے تو یہ فرض امتِ مسلمہ سے ساقط ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر عالمِ اسلام خلیفہ کے وجود سے خالی ہے تو پوری امت بحیثیت امت گنہگار اور تارکِ فرض ہے۔ اس وقت امتِ مسلمہ کی

پوزیشن یہ ہے کہ ہم ایک شرعی فریضہ کے تارک ہیں جس کی سزا ہم دنیا میں بھگت ہی رہے ہیں۔ اللہ کرے کہ دنیا میں کہیں خلافت کا وجود ہو۔ خلافت کی اصطلاح تو ہم نے بھی چھوڑ رکھی ہے، ہم بھی نفاذِ اسلام کی بات خلافت کے حوالے سے نہیں کرتے، البتہ دنیا میں خلافت کی تحریکیں ہیں۔

دنیائے اسلام میں بیسیوں تحریکیں ہیں جو خلافت کے عنوان سے کام کر رہی ہیں، میرے بعض سے روابط اور تعلقات ہیں، ان کے بارے میں معلومات بھی ہیں۔ لندن میں ٹریفالیگر اسکوائر ہے، یوں سمجھ لیں جیسے مال روڈ ہے، جہاں لوگ جلوس نکالا کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے وہاں ایک جماعت نے خلافت کی حمایت میں ریلی نکالی، میں اس میں شریک ہوا اور تقریر بھی کی۔ انہوں نے امریکی سفارت خانے کے سامنے مظاہرہ کیا۔ برطانیہ کے کالج کے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں ننگے سر ننگے پاؤں امریکی سفارت خانے کے سامنے کھڑے ہو کر مظاہرہ کر رہے تھے اور ''خلافہ خلافہ'' اور ''جہاد جہاد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ کھڑا نعرے لگا رہا تھا، مجھے وہ منظر بڑا اچھا لگا کہ کہیں کوئی خلافت کی بات کرتا تو ہے۔

لیکن لطیفے کی بات یہ ہے جب وہاں یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا ایک صاحب کھڑے ہیں، لمبا چوغہ پہنا ہوا ہے، سر پر تاج پہن رکھا ہے، ہاتھ میں عصا پکڑا ہوا ہے۔ وہ مجھے ملے اور کہنے لگے میں امیر المومنین ہوں میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ میں نے کہا تم کدھر سے آ گئے ہو؟ تو اس نے کہا میں ترکی ہوں، عثمانی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ خلافت سے اتفاق کرتے ہیں؟ میں نے کہا نتفق علی الخلافۃ لا علی الخلیفۃ ہم خلافت پر متفق ہیں، خلیفہ پر متفق نہیں ہیں۔ پہلے خلافت کا ماحول بناؤ، اس طرح کوئی خلیفہ نہیں بنے گا کہ چوغہ پہن کر کہے میرے ہاتھ پر بیعت کرو، ایسا نہیں ہو گا۔ ہم خلافت کے نام پر بھی لطیفے ہی کرتے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور میں سیمینار تھا۔ پاکستان میں خلافت کے نام سے کام کرنے والے دس گیارہ گروپوں کو تو میں جانتا ہوں، سب سے میرا رابطہ رہتا ہے، سب نے مل کر لاہور میں ایک سیمینار کیا ''خلافہ سیمینار''۔ اس میں مجھے بھی بلایا، میں نے اس میں لیکچر دیا کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ خلافت کی حدود، تقاضے اور مقاصد کیا ہیں، اور خلافت کیسے بنے گی؟ میری وہ تقریر ''الشریعہ'' کے کسی پرچے میں چھپی تھی۔ میں نے آخر میں ایک چٹکلہ چھوڑا، جو میری عادت ہے، میں نے کہا کہ آپ خلافت کی بات کریں، خلیفہ کی بات نہ کریں، اس لیے کہ اس وقت جو میرے سامنے ستر پچھتر آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ان میں

سے گیارہ کو تو میں جانتا ہوں کہ یہ خلیفہ ہیں۔ اگر صرف لاہور میں گیارہ خلیفہ ہیں تو پاکستان میں کتنے ہوں گے؟ پھر دنیا میں کتنے ہوں گے؟ میں نے کہا یہ خلافت نہیں ہے، اس سے امت کو بچاؤ۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم خلافت کی بات اس لیے نہیں کرتے کہ خلافت قائم ہو، اس لیے کرتے ہیں کہ میں خلیفہ بنوں۔ ہم میں سے جو بھی خلافت کی بات کرتا ہے اس کا یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ کسی جگہ میں خلیفہ بن جاؤں، چاہے ایک شہر کا ہی بنوں، لوگ مجھے امیر المومنین کہیں۔

پاکستان میں
نفاذِ شریعت کی جدوجہد

قیامِ پاکستان اور دستور سازی

پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان ہندوستان کو تقسیم کر کے بنا ہے۔ جب انگریز برصغیر میں آئے تھے تو متحدہ ہندوستان اورنگزیب کے زمانے سے ایک ملک چلا آ رہا تھا جو اَب چار ملکوں میں تقسیم ہو گیا ہے یعنی بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور برما۔ جب انگریزوں نے یہاں قبضہ کیا تو

- پہلے انہوں نے برما کو الگ کیا۔
- اس کے بعد ہندوستان کی آزادی کے وقت یہاں کی سیاسی پارٹیوں میں دو نقطۂ نظر سامنے آ گئے کہ مسلمانوں کے لیے الگ ملک ہونا چاہیے، اس پر آپس کی تقسیم بھی ہوئی اور اختلافات بھی ہوئے لیکن بہرحال پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو الگ الگ آزاد ریاستیں تسلیم کی گئیں۔
- پھر پاکستان میں دو حصے شامل تھے، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان، ایوب خان کے زمانے میں پاکستان کے یہ دو بڑے صوبے تھے۔ پھر یحییٰ خان کے زمانے میں یہ دو حصے الگ ہو گئے، مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا، اور مغربی پاکستان اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے الگ ملک بنا۔

یوں اس تقسیم میں چار الگ الگ ملک دنیا کے نقشے پر موجود ہیں۔

اسلامی یا سیکولر ریاست؟

پاکستان بن جانے کے بعد نفاذِ اسلام کی جدوجہد کن مراحل سے گزری اور کیا پیشرفت ہوئی؟ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو بنگلہ دیش بھی مشرقی بنگال کے طور پر ہمارا حصہ تھا۔ اس وقت پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بھی دونوں حصوں سے تھی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان سے منتخب نمائندوں سے متفقہ دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی جس نے یہ طے کرنا تھا کہ پاکستان کا دستور اور آئین کیا ہو گا اور پاکستان کا نظام کیا ہو گا۔ دستور ساز اسمبلی کے طور پر ملک میں انتخاب ہوا اور ملک کے مختلف حصوں سے

نمائندے منتخب ہو کر آئے۔ ان میں مشرقی پاکستان سے سلہٹ کے علاقے سے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جو جمعیت علماء اسلام کے سربراہ تھے منتخب ہو کر دستور ساز اسمبلی میں آئے اور دستور سازی کا آغاز ہو گیا۔

پاکستان بننے کے بعد دستور ساز اسمبلی میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گا یا سیکولر ریاست ہو گا؟ ملک کے دستور اور آئین کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق ہو گا یا نہیں ہو گا؟ دستور ساز اسمبلی میں دستور کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ بحث شروع ہو گئی۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح مرحوم تھے، وزیراعظم خان لیاقت علی خان مرحوم تھے، وزیر قانون جوگندر ناتھ ہندو تھے، اور وزیر خارجہ ظفر اللہ قادیانی تھا۔ یہ ایک مخلوط سی وزارت تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں سب سے پہلا مسئلہ یہ پیش آیا کہ پاکستان اسلامی ریاست ہو گی یا سیکولر ریاست ہو گی؟ مشرقی پاکستان سے بہت سے ہندو بھی نمائندے تھے، اور مسلم لیگی یا دوسروں میں بھی بہت سے سیکولر لوگ تھے جو پاکستان کو ایک مسلمان ریاست تو تسلیم کرتے تھے لیکن اسلامی ریاست تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یہ بہت بڑا حلقہ تھا جو اَب بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے بنا ہے، اسلام کے لیے نہیں بنا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی بالادستی سے بچانے کے لیے ہم نے الگ ملک لیا تھا، اسلام کا نفاذ اور اسلام کا قانون اور دستور ہمارے پیشِ نظر نہیں تھا۔ ایک بڑا حلقہ یہ کہتا ہے۔

لیکن چونکہ قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ تعالیٰ جو کہ تحریک پاکستان کے بنیادی لیڈروں میں سے تھے، ان کے واضح اعلانات موجود ہیں کہ پاکستان میں اسلام کا نظام نافذ ہو گا، قرآن و سنت کے نفاذ کے لیے ہم نے یہ ملک لیا ہے، پاکستان ایک اسلامی، رفاہی اور نظریاتی ریاست ہو گی۔ اس پر لوگوں نے قربانیاں دی تھیں جو کہ آج بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔ اس لیے سیکولر لوگ اپنی بات پر زیادہ زور نہ دے سکے اور بالآخر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں سے خان لیاقت علی خان نے مضبوط موقف اختیار کیا اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسمبلی کے اندر بنیادی طور پر محنت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم کی تھی، جبکہ اسمبلی سے باہر مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے رائے عامہ منظم کرنے کے لیے محنت کی۔ ان میں جمعیت علماء اسلام کے رہنما مفتی محمد شفیعؒ، مولانا احتشام الحق تھانویؒ، جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اہلِ حدیث رہنما مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ، بریلوی علماء میں سے دو بڑے اکابر مولانا حامد بدایونیؒ اور پیر

صاحب آف مانکی شریفؒ شامل تھے۔ ان حضرات نے عوام میں محنت کی کہ ملک کا دستور اسلامی ہونا چاہیے۔ کچھ عوامی دباؤ سے اور کچھ اسمبلی میں مضبوط نمائندگی سے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ خود اسمبلی میں موجود تھے، انہوں نے یہ مہم سر کر لی کہ دستور ساز اسمبلی نے ''قرارداد مقاصد'' پاس کر کے ہمیشہ کے لیے یہ طے کر دیا کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہوگا، اور اس میں دستور اور قانون کی تشکیل میں اسلام، قرآن مجید اور سنتِ رسول کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

قراردادِ مقاصد کیا ہے؟ یہ ذکر کرنے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ نفاذِ اسلام کے لیے دو تین اہم سوال ہمارے سامنے آ گئے تھے جن کا فیصلہ کیے بغیر پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دینا مشکل تھا۔

نظامِ حکومت کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟

ایک بات یہ تھی کہ پاکستان کا نظامِ حکومت کیسا ہوگا؟ دنیا میں دو تین قسم کے نظامِ حکومت چلتے آ رہے ہیں:

1. ایک تصور یہ تھا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ چونکہ بانیٔ پاکستان ہیں، اس لیے انہیں بادشاہ تسلیم کر لیا جائے اور ان کی جو اولاد ہے وہ ملک کی قیادت کرتی رہے۔ یعنی شخصی خاندانی حکومت کہ باپ کے بعد بیٹا، پھر دوسرا بیٹا، پھر بھائی وغیرہ۔
2. جبکہ دوسرا تصور یہ تھا کہ ملک میں جمہوری حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے قائم کی جائے۔

اسلامی ریاست بنانے کا مسئلہ پیش آیا تو اس وقت یہ دو آئیڈیل دستور ساز اسمبلی کے سامنے تھے۔

ایک خلافت عثمانیہ کا نمونہ ہمارے سامنے تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ۱۹۲۴ء میں ہوا اور پاکستان ۱۹۴۷ء میں بنا۔ خلافتِ عثمانیہ جو تقریباً چار سو سال سے زیادہ عرصہ گزار کر دنیا سے رخصت ہوئی تھی، وہ ماڈل بھی سامنے تھا، لیکن وہ نظام خاندانی اور نسلی تھا اس لیے وہ آج کے دور میں قابلِ قبول نہیں تھا۔ اور اس کے بعد عالمِ اسلام میں جو ماڈل آیا تھا وہ سعودی عرب کا تھا۔ آلِ سعود نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد سعودی عرب کی تشکیل کی تھی اور حکومت قائم کی تھی۔ سعودی عرب نے اگرچہ یہ اعلان کیا تھا کہ ہم قرآن و سنت کے مطابق حکمرانی کریں گے لیکن حکومتی نظام بادشاہی ہوگا۔ حتیٰ کہ شاہ عبد العزیز مرحوم کو ہمارے بعض اکابر ہندوستانی علماء کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی تھی کہ آپ خلافت کا اعلان کریں، ہم

آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کریں گے۔ لیکن انہوں نے کہا تھا کہ نہیں! سعودی عرب میں نظامِ حکومت بادشاہی ہوگا، البتہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ سعودی عرب کا نظام بھی ایک خاندانی بادشاہی نظام تھا، جو پاکستان میں قابلِ عمل نہیں تھا۔ سعودی عرب میں بادشاہ کون ہوگا، اس کا فیصلہ وہاں کے عوام نہیں کرتے بلکہ آلِ سعود کا خاندان اس کا انتخاب کرتا ہے۔

چنانچہ دستور ساز اسمبلی کے سامنے جو سوالات رکھے گئے، ان میں یہ سوال تھا کہ آپ خاندانی نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ دو ماڈل خلافتِ عثمانیہ اور آلِ سعود آپ کے سامنے ہیں۔ یہ دونوں پاکستان کے اس وقت کے حالات کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں تھے اور آج کے حالات میں بھی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ تو نہیں ہوسکتا تھا، پھر کیا کیا جائے؟

''قراردادِ مقاصد'': نظامِ مملکت کی تین بنیادیں

لہٰذا قراردادِ مقاصد نے یہ طے کیا کہ نظامِ حکومت تو جمہوری ہوگا لیکن نظامِ مملکت قرآن و سنت کے تابع ہوگا۔ یوں ہی سمجھ لیجیے جیسے سعودی عرب میں قوانین شرعی ہوں گے اور حکومت بادشاہی ہوگی۔ بالکل اسی نہج پر یہاں یہ طے کیا گیا کہ قوانین شرعی ہوں گے اور حکومت جمہوری ہوگی۔ خلافت کا عنوان نہ سعودی عرب نے اختیار کیا اور نہ پاکستان نے اختیار کیا۔

قراردادِ مقاصد کی تین بنیادیں ہیں جس میں یہ باتیں طے کر دی گئیں:

1. پہلا اصول قراردادِ مقاصد میں طے کیا گیا کہ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جمہوریت کی بنیادی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ''عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے''۔ یعنی حاکمیتِ اعلیٰ عوام کی ہوگی، عوام جو فیصلہ کر دیں، فائنل اتھارٹی سوسائٹی ہے۔ لیکن قراردادِ مقاصد میں طے ہوا کہ پاکستان میں حاکمیتِ اعلیٰ عوام کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔
2. قرارداد مقاصد میں دوسرا اصول یہ طے ہوا کہ نظامِ حکومت نہ بادشاہی ہوگا اور نہ خاندانی ہوگا بلکہ عوام کی رائے کی بنیاد پر جمہوری حکومت ہوگی۔
3. تیسرا اصول یہ طے کیا گیا کہ حکومت اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے تابع ہوں گے۔ حکومت اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے منافی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے گی۔

جب قراردادِ مقاصد پاس ہوگئی تو یہ کہا گیا کہ پاکستان نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ جیسے کوئی آدمی کلمہ پڑھ لیتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، آگے اس کا تعلق اعمال سے ہے، لیکن کلمہ پڑھنے سے بہرحال وہ

مسلمان سمجھا جاتا ہے۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان ایک اسلامی ریاست تسلیم کیا گیا اور بالکل اسی طرح دنیا کے نقشے پر وجود میں آیا جیسے کوئی آدمی کلمہ پڑھ کر خود کو مسلمانوں کی فہرست میں شامل کرلیتا ہے۔

نفاذِ اسلام کیلئے غیر مسلم رہنماؤں کا کردار

قراردادِ مقاصد کے تعین میں جو اصول طے ہوئے، اس میں جن لوگوں کا کردار ہے ان کا اعتراف ہونا چاہیے۔ پاکستان بننے کے بعد جو نفاذِ شریعت کی دستوری اور قانونی جدوجہد میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم رہنما بھی ہمارے ساتھ شریک رہے ہیں۔ ان میں بطور خاص اے آر کارنیلس جو بعد میں پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی ہوئے ہیں، وہ عیسائی تھے لیکن اس کے باوجود پاکستان میں مسلسل نفاذِ شریعت کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں جاتے تو پاکستان کے نظریاتی تشخص کا دفاع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان چونکہ مسلمانوں کی اکثریت کا ملک ہے اور اسلام کے نام پر بنا ہے اس لیے پاکستان میں نفاذ اسلام پاکستانیوں کا حق ہے اور میں ان کے حق کی تائید کرتا ہوں۔ دوسرے عیسائی رہنما آنجہانی جوشوا فضل دین جو مسیحیوں کے بڑے لیڈروں میں سے تھے اور مغربی پاکستان کی اسمبلی کے منتخب رکن تھے۔ وہ یہ آواز لگایا کرتے تھے کہ پاکستان میں اسلام اور شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیے، ہم عیسائیوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ہمیں خوشی ہوگی کہ پاکستان میں اسلامی تعلیمات اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق نظام قائم ہو، ہم پورا ساتھ دیں گے۔ یہ دونوں رہنما پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لیے غیر مسلم حلقوں کی طرف سے بڑی مضبوط آواز تھے۔

ان کے علاوہ اسمبلی میں خان لیاقت علی خان اور عوامی محاذ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا مفتی محمد حسن، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی اور پیر صاحب آف مانکی شریف رحمہم اللہ تعالیٰ تمام مکاتبِ فکر کے ان سرکردہ حضرات نے ملک میں یہ راہ ہموار کرنے کے لیے محنت کی، اور یہ ان کی مجموعی محنت کا نتیجہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کر کے پاکستان کی ریاستی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔

مگر کونسا اسلام؟

اس کے بعد دوسرا مسئلہ پیش آگیا۔ سیکولر حلقوں نے یہ سوال اٹھادیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام نافذ ہوگا؟ دیوبندیوں کا؟ بریلویوں کا؟ اہلِ حدیثوں کا؟ یا شیعوں کا؟ اس وقت یہ چار بڑے فرقے تھے، اب بھی یہی فرقے ہیں۔

شیعہ اس ملک میں بڑی تعداد میں ہیں، ان کی آبادی تین چار فیصد بتائی جاتی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کے بانی قائدِاعظم محمد علی جناحؒ شیعہ تھے، اس لیے ہم زیادہ حق رکھتے ہیں۔ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ خاندانی طور پر تو شیعہ ہی تھے، جو بعد سنی ہو گئے تھے یا نہیں، یہ الگ مسئلہ ہے۔ بہرحال شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے بانی ہم ہیں تو ہمارا استحقاق زیادہ ہے۔

سنی کہلانے والوں میں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث تین مکاتبِ فکر تھے۔ بلکہ میں تو اکثر کہا کرتا ہوں کہ جس وقت ہم نفاذِ اسلام کی جنگ کا آغاز کر رہے تھے تو ہمارے ہاں چار نہیں بلکہ ساڑھے چار مکاتبِ فکر تھے۔ جماعتِ اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اگرچہ کسی فرقے میں ہونے کے دعویدار نہیں تھے لیکن یہ مستقل مکتبِ فکر تھا۔ وہ ان چار میں کسی فرقے کے دعویدار نہیں لیکن ان کا وجود ہے اور محنت ہے، اس لیے میں ساڑھے چار مکاتبِ فکر کہتا ہوں۔

اب یہ اشکال سامنے تھا کہ تعبیرات کس کی ہوں گی؟ قرآن و سنت کے قوانین نافذ ہوں گے تو دیوبندی تعبیر کے مطابق ہوں گے یا شیعہ تعبیر کے مطابق؟ بریلوی تعبیر کے مطابق ہوں گے یا اہلِ حدیث تعبیر کے مطابق؟ یا مولانا مودودیؒ کی تعبیرات کے مطابق؟ یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا کیا گیا کہ اسلام کا نفاذ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے، اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے تاکہ کوئی فرقہ دوسرے پر حاوی نہ ہوسکے اور فرقہ وارانہ کشمکش سے نجات ملے۔ یہ بہت بڑا اشکال تھا جس نے ملک میں خلفشار پیدا کر دیا کہ یہاں اسلام نافذ کرنا ہے تو کون سا اسلام؟

۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء کے بائیس نکات

اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر دیں جنہوں نے اس کے لیے محنت کی اور اس اعتراض کا دوٹوک جواب مہیا کیا۔ ان محنت کرنے والوں میں ایک سردار مولا بخش سومرو تھے۔ ہم اپنے حلقے کے علاوہ باقی لوگوں کو بھول جایا کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ابھی پچھلی قومی اسمبلی میں احمد

میاں سومرو تھے، ان کے والد مولا بخش سومرو سندھ کے بڑے سرداروں میں سے تھے۔ وہ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مرید اور بہت دیندار آدمی تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں منسٹر رہے ہیں۔ پرانے بزرگوں میں سے تھے۔ تحریک چلانے والوں میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ، مولانا متین خطیبؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ تھے، انہوں نے ملک بھر میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء سے رابطہ قائم کر کے سال ڈیڑھ سال اس مسئلے پر محنت کی کہ ہم سب مل کر دستوری حوالے سے ایک متفقہ فارمولہ دے دیں کہ ہم اس پر متفق ہیں اور ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہمارے اختلافات دستور اور قانون کے مسائل پر نہیں ہیں، کچھ اور مسائل پر ہمارے اختلافات ہیں، دستور اور قانون کے دائرے پر ہم متفق ہیں، اس کو نافذ کر دیا جائے۔ اس کے لیے کراچی میں سردار مولا بخش کی کوٹھی پر کئی دن میٹنگیں ہوتی رہیں۔ ایک بہت بڑا نام جنہوں نے ان سب میٹنگوں کی صدارت کی تھی مولانا علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ ہیں۔ اس میں ایک نومسلم ''روڈ ٹو مکہ'' والے علامہ محمد اسدؒ بھی شریک تھے۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی ایک پوری ٹیم تھی۔

اکتیس سرکردہ علماء کرام اکٹھے ہوئے جنہوں نے بائیس دستوری نکات مرتب کیے۔ ان نکات پر سب متفق تھے، سب نے دستخط کیے اور یہ اعلان کیا کہ یہ بائیس نکات متفق علیہ ہیں۔ جس پر دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، جماعتِ اسلامی اور شیعہ کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں تمام طبقوں کی اعلیٰ ترین قیادت شریک ہوئی۔ شیعہ حضرات کی طرف سے مولانا مفتی جعفر حسینؒ، علامہ حافظ کفایت حسینؒ جو ان کی ٹاپ کی لیڈرشپ تھی، بریلوی حضرات میں مولانا حامد بدایونیؒ، پیر صاحب آف مانکی شریفؒ اور سندھ کے بڑے پیر صاحب تھے۔ اہلِ حدیث حضرات میں مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا اسماعیل سلفیؒ اور مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ، اور جماعت اسلامی کے مولانا مودودیؒ بھی اس میں شامل تھے۔ یعنی چاروں پانچوں مکاتب فکر کی اس وقت کی جو موجود اعلیٰ قیادت تھی وہ شریک ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر بائیس نکات منظور کر کے بتایا کہ دستور اور قانون کے مسائل پر ہمارا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہم ان بائیس نکات پر متفق ہیں اس کو نافذ کر دیا جائے۔ یہ دوسرا معرکہ ہمارے بزرگوں نے اس طرح سَر کیا۔ چنانچہ ہمارا قانونی اور دستوری اسلام متفقہ ہے، باقی ہمارے اختلافات الگ نوعیت کے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں ستاون علماء کے سینتیس نکات

چند سال پہلے یہ مسئلہ پھر نئے سرے سے کھڑا ہوا۔اِس وقت ہمارا ایک مشترکہ فورم ہے ''ملی مجلس شرعی'' کے نام سے۔ بریلوی مکتبِ فکر کے مفتی محمد خان قادری اس کے صدر ہیں، میں اس کا نائب صدر ہوں، ڈاکٹر محمد امین سیکرٹری جنرل، اور مولانا عبدالغفار روپڑی بھی نائب صدر ہیں۔ ہم نے ایک بار پھر ملک گیر اجتماع کیا۔ لاہور میں تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے ستاون اکابر علماء کو جمع کیا اور مشترکہ قومی کنونشن میں آج کے اکابر علماء سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، جماعت اسلامی سب نے اکٹھے ہو کر اعلان کیا کہ بائیس نکات پر آج بھی ہمارا اتفاق ہے اور اس کے ساتھ ہم پندرہ نکات کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اس میں الحمد للہ میرا بھی حصہ ہے، میں اس کا متحرک رکن ہوں۔ اس میں ہم نے دو کام کیے۔

- ایک تو پھر سے بائیس نکات کی توثیق کرا دی،
- اور دوسرا اُن کی وضاحت میں پندرہ نکات کا اضافہ کیا۔

یہ بہت بڑا معرکہ تھا جو سَر کیا گیا اور ان لوگوں کا منہ بند کیا گیا جو کہتے تھے کہ کس کا اسلام نافذ کرنا ہے؟ علماء نے جواب دیا کہ ہم سب کا اسلام ایک ہے۔ اور یہ اعلان کیا کہ ہم آج بھی وہی کھڑے ہیں، جہاں ۱۹۵۱ء میں کھڑے تھے۔

مذہب اور ریاست کا باہمی تعلق

آج کی دنیا میں تین ملک ہیں جہاں اپنے اپنے طور پر مذہب کو حکومت کی اساس قرار دیا گیا ہے۔

سعودی عرب کا حکومتی نظم

پہلا ملک سعودی عرب ہے جس کا آئین یہ ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق نظام چلے گا، لیکن فیصلے کی فائنل اتھارٹی بادشاہ ہے۔ سعودیہ میں آخری اتھارٹی امرِ ملکی ہے، نہ کسی کو اسے چیلنج کرنے کا اختیار ہے اور نہ اختلاف کا حق حاصل ہے۔ سعودی عرب میں قرآن و سنت کے مطابق نظام چلتا ہے لیکن فائنل اتھارٹی امر ملکی ہے۔

اس کے علاوہ دو ملک ہیں جنہوں نے دستوری طور پر اپنے تصورات کو نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایران نے امامت کے تصور کو، اور پاکستان نے دستوری طور پر خلافت کے تصور کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں کا فرق ذرا سمجھ لیں۔

ایران کا دستوری نظم

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اہلِ تشیع کے ہاں حاکمیتِ اعلیٰ امام غائب کی ہے کیونکہ وہ اللہ کا نمائندہ ہے۔ ایرانی دستور کا مطالعہ کریں بڑی دلچسپ دستاویز ہے۔ امامِ غائب کی نیابت میں فقیہ کی ولایت کا تصور ہے۔ یعنی حاکمیتِ اعلیٰ فقیہ کی ہے امامِ غائب کی نیابت میں۔ اور ولایتِ فقیہ کو وہی اختیارات حاصل ہیں جو امام معصوم کے ہیں۔

اب جب کہ بارہواں امام غائب ہے تو اس کا نمائندہ ولایتِ فقیہ ہے۔ یعنی اپنے ملک کے فقہاء میں سے جس کو منتخب کر لیا جائے وہ ولایتِ فقیہ کے درجے میں ہے، اس کے ساتھ ایک شوریٰ نگہبان ہوتی ہے جس میں غالباً چھ علماء اور پانچ قانون دان ہوتے ہیں۔ شوریٰ نگہبان کو ولایتِ فقیہ نامزد کرتی ہے۔ پہلے خمینی صاحب ولایتِ فقیہ کے منصب پر تھے، ان کے بعد اب ولایتِ فقیہ کے منصب پر خامنائی صاحب ہیں۔ ایران کا صدر الگ ہے، پارلیمنٹ الگ ہے، چیف جسٹس اور وزیر اعظم الگ ہے،

اور رہبرِ انقلاب جس کا دستوری نام ''ولایت فقیہ'' ہے وہ الگ ہے۔ ولایت فقیہ کے اختیارات میں یہ بات ہے کہ وہ سپریم کورٹ، صدر اور پارلیمنٹ کا فیصلہ مسترد کر سکتے ہیں، جبکہ ولایتِ فقیہ کے کسی فیصلے سے کسی کو اختلاف کا حق نہیں ہے۔

الغرض ایرانی دستور میں حاکمیتِ اعلیٰ امام غائب کی ہے، اس کے نائب ولایتِ فقیہ ہیں، جس کے ساتھ ایک شوریٰ ہے۔ ان کے اختیارات کے دائرے میں پارلیمنٹ منتخب ہوتی ہے، صدر اور وزراء منتخب ہوتے ہیں، اور سپریم کورٹ بھی ان کے دائرے میں ہے۔ میں اس کو یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ اہلِ تشیع نے اپنے امامت کے تصور کو ولایتِ فقیہ کے ٹائٹل کے ساتھ دستوری شکل دی ہے۔

پاکستان کا دستوری نظم

پاکستان بننے کے بعد ہمیں بھی یہ مسئلہ پیش آیا تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے، انہوں نے اس مسئلے کا ''قراردادِ مقاصد'' کی صورت میں حل یہ نکالا کہ دستور میں حاکمیتِ اعلیٰ نہ جمہور کی ہے، نہ ولایتِ فقیہ کی ہے، اور نہ علماء کی ہے۔

(۱) حاکمیتِ مطلقہ اور حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔

(۲) حکومت کرنے کا حق عوام کے منتخب نمائندوں کو ہے۔

(۳) حکومت اور پارلیمنٹ قرآن و سنت کے احکامات کے پابند ہوں گے۔

یہ ہمارے دستور کی تین بنیادیں ہیں۔

جب بھی کوئی طبقہ یا گروہ خود حکومت قائم کرے گا تو وہ طاقت کے ذریعے قائم ہوگی جیسے کوئی فوج کے ذریعے قبضہ کر لے، یا خاندانی بنیاد پر قائم ہوگی کہ باپ فوت ہوا تو اس کا بیٹا آجائے، یا عوام کی رائے سے حکومت قائم ہوگی، یہ تین ہی راستے ہیں۔ ہم نے دستوری طور پر خاندانی حکومت کو بھی قبول نہیں کیا، اور مطلق جمہوریت کو بھی قبول نہیں کیا، ہم نے تیسرا راستہ اختیار کیا کہ حکومت کا حق اس کو ہوگا جس کو لوگ منتخب کریں گے، اور حکومت قرآن و سنت کے دائرے سے باہر کوئی قانون سازی نہیں کر سکے گی۔

دستور پر عمل ہونا الگ بات ہے لیکن اصولاً پورا دستور ان تین بنیادوں پر کھڑا ہے، البتہ ٹائٹل خلافت کا نہیں ہے۔ اگر آج ہم خلیفہ کا انتخاب کریں اور خلافت قائم کریں تو اس کے بھی یہی تین اصول ہوں گے۔ (۱) حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے (۲) خلیفہ کا انتخاب عوام کی صوابدید سے ہوگا (۳) خلیفہ قرآن و

سنت کا پابند ہوگا۔

معروضی حالات میں خلافت کے تصور کو ہمارے ہاں دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی، اور ایران میں امامت کے تصور کو دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایران میں امامت کے تصور پر جو دستور بنایا گیا اس پر عمل ہو رہا ہے، جبکہ ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی بالادستی کا دستور بنایا گیا ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسٹیبلشمنٹ نے ساری باتیں روک رکھی ہیں۔ اس لیے میں اکثر یہ بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دستور اسلامی ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں دستور اسلامی ہے، لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور اس عمل نہ ہونے کی وجہ اسٹیبلشمنٹ کی منافقت اور ہماری بے حسی ہے کہ ہم دنیا کے ہر کام کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں، لیکن پاکستان کے دینی مکاتب فکر دستور کی پابندی کے نام پر اور نظامِ شریعت کے نفاذ کے لیے اکٹھے نہیں ہوتے۔ جس دن ہم اس کے لیے اکٹھے ہو گئے اس دن ہم دباؤ ڈال کر اس کے عملدرآمد کا راستہ بھی نکال سکتے ہیں بشرطیکہ ہم کوئی محاذ بنا کر اکٹھے ہوں۔

ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق کے تین رجحانات

ریاست کی بنیاد اسلام پر ہونی چاہیے، ریاست میں اسلام کے قوانین ہونے چاہئیں، اور ریاست کا نظریاتی تشخص ہونا چاہیے، اس پر عالمِ اسلام میں مجموعی طور پر تین حلقے پائے جاتے ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں مصروف عمل ہیں۔

1. مسلم ممالک میں ایک حلقہ ان لوگوں کا ہے جو تعداد میں کم ہیں لیکن مؤثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ریاست کے ساتھ مذہب کا تعلق پرانی بات ہے۔ یہ طبقہ مسلمان ہے، کلمہ بھی پڑھتے ہیں، نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، لیکن ریاست کے ساتھ مذہب کا کوئی تعلق تسلیم نہیں کرتے۔ مسلمانوں میں ایسے سیکولر حلقے موجود ہیں جو یہ بات کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ مؤثر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح مغرب نے ریاست کے ساتھ مذہب کے تعلق کو ختم کر دیا ہے، ہمارے ہاں بھی مذہب کو ریاست میں کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔

مغرب کا کہنا یہ ہے اور اسی بات پر اقوام متحدہ کی تشکیل ہوئی ہے کہ مذہب کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، مذہب کسی فرد کا انفرادی معاملہ ہے، مذہب کا دائرہ معاشرت تک نہیں بلکہ ایک شخص اور فرد تک ہے۔ اسی لیے جب ہم معاشرے اور ریاست و حکومت کے

لیے مذہب کی بات کرتے ہیں، یا کسی معاملہ میں مذہبی روایت کو بنیاد بناتے ہیں، تو آج کے عالمی نظام کو اعتراض ہوتا ہے کہ یہ مذہب کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ بہت سے دانشور اس فکر کی ترجمانی کر رہے ہیں کہ جس طرح مغرب نے مذہب کو فرد کے ذاتی مسئلے کے طور پر قبول کیا ہوا ہے، ہمیں بھی اس کو ذاتی مسئلہ قرار دینا چاہیے اور ریاست کے ساتھ مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ ریاست کی بنیاد عوام کی حکمرانی اور پارلیمنٹ کی خود مختاری پر ہونی چاہیے۔ یہ دو باتیں کہی جاتی ہیں (۱) عوام کی حکمرانی اور (۲) پارلیمنٹ کی خود مختاری۔ یعنی پارلیمنٹ کو عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ جو دستور اور قانون طے کرنا چاہے طے کرے، جس قانون کو چاہے ختم کرے، جس کو چاہے بحال رکھے۔

2. دوسرا طبقہ جو بہت بڑی تعداد میں ہے، ان کا کہنا ہے کہ مذہب کا ریاست کے ساتھ تعلق تو ہونا چاہیے، ملک کو اسلامی شناخت بھی رکھنی چاہیے، اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب بھی ہونا چاہیے، لیکن کیا مکمل اسلام کا نفاذ آج کے دور میں ممکن ہے؟ وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کا جو حکم جمہوری ڈھانچے میں ایڈجسٹ ہو جائے تو وہ ٹھیک ہے اسے نافذ کر لیں، اور جو حکم ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا اس پر اصرار نہ کریں۔ ہمارے ملکوں کے حکمران زیادہ تر اِسی فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مذہب، اس کے معاشرتی کردار اور مذہبی قوانین کے نفاذ کی نفی نہیں کرتے، لیکن کہتے ہیں جتنا ایڈجسٹ ہو جائے وہ ٹھیک ہے ورنہ اس پر اصرار نہ کیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ دوسرا طبقہ بہت زیادہ مؤثر ہے جو اس وقت عملاً مسلم دنیا میں حکومت کر رہا ہے۔

3. جبکہ تیسرا طبقہ کہتا ہے کہ ریاست کا تشخص اسلام کے نام سے ہونا چاہیے اور ریاست کے قوانین کی بنیاد قرآن وسنت پر ہونی چاہیے۔ پارلیمنٹ کو پابند ہونا چاہیے کہ وہ قرآن وسنت کے قوانین کو نافذ کرے اور اسلام کے خلاف کوئی قانون پاس نہ کرے۔ جب ۱۹۷۳ء کا دستور بنا، یا اُس سے پہلے قراردادِ مقاصد منظور ہوئی تو اس کی بنیاد اسی پر تھی۔ اس وقت دستور ساز اسمبلی میں جو مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام موجود تھے انہوں نے اسی بنیاد پر دستور میں بہت سی دفعات شامل کروانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ دستور کی تشکیل اس کے اسلامی تشخص کو واضح کرنے میں دینی جماعتیں کامیاب ہوئیں، مگر دستور کے مطابق نفاذ کا

اختیار انہی قوتوں کے ہاتھ میں ہے جو ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ میں سنجیدہ نہیں ہیں اور تمام معاملات میں اسلامی قوانین کے نفاذ کو ضروری نہیں سمجھتے۔

قادیانی مسئلہ

اس کے بعد ایک تیسرا مرحلہ درپیش آگیا۔ دیکھیں آج کے دور میں اسلام نافذ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بڑے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں اور بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد تیسرا مسئلہ قادیانیوں کے حوالے سے پیش آگیا جو بڑا زبردست مسئلہ تھا۔ قادیانی ختمِ نبوت کے واضح منکر تھے اور اب بھی منکر ہیں اور مرزا غلام احمد کی نبوت کے قائل ہیں۔ ایک خالص اسلامی ریاست میں ہمارے ماضی کے حوالے سے ختمِ نبوت کے منکر اور مرتد کے لیے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس پر ایک دلچسپ بحث کا حوالہ دوں گا۔

مرزا غلام احمد نے ایک دفعہ ایسا کیا کہ افغانستان میں امیر حبیب اللہ خان کے پاس دو نمائندے بھیجے۔ جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تھی، تو مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی دنیا کے مختلف حکمرانوں کے پاس خطوط بھیجے۔ اپنے دو نمائندے امیر حبیب اللہ خان کے پاس کابل بھیجے اور اپنے ”اسلام“ کی دعوت دی۔ امیر حبیب اللہ خان نے دو لفظوں میں بڑا سادہ سا جواب دیا: ”ایں جا بیا“ کہ یہ بات کابل میں آکر کرو۔ یعنی ہندوستان میں بیٹھ کر انگریزوں کی حکومت میں یہ بات کر رہے ہو، یہاں آکر یہ بات کرو۔ اس کے بعد اس کے کچھ مبلغین افغانستان گئے تو امیر حبیب اللہ خان نے اس کے ایک یا دو مبلغوں کو ارتداد کے جرم میں قتل کروا دیا۔

مرتد کی سزا کی بحث

اس پر ہمارے ہاں یہ بحث چھڑ گئی کہ مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں ہے؟ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ ہمارے متجددین میں سے بہت سے لوگ اس کو حد نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ لوگوں کو قتل کروایا تھا وہ سیاستاً حکمتِ عملی کے تحت تھا، قانوناً نہیں تھا۔ اس وقت مرزا غلام احمد کے بعد قادیانی دو حصوں میں تقسیم تھے، لاہوری اور قادیانی۔ لاہوریوں کا امیر مولوی محمد علی تھا جو کہ بہت فاضل آدمی تھا لیکن اللہ کی قدرت ہے، ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ علمی اور فکری

دنیا میں بہت بڑا آدمی تھا اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس نے اس بحث کو شروع کیا کہ امیر حبیب اللہ خان نے یہ غلط کیا ہے، اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے، یہ حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے جس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس زمانے میں ''الشہاب'' کے نام سے دیا۔ رسالہ الشہاب مختصر سا تھا لیکن بہت جامع تھا۔ اس میں انہوں نے قرآن و سنت اور اجماعِ امت سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں ارتداد کی متعیّن سزا قتل ہی ہے اور یہ حد ہے، سیاست یا تعزیر نہیں ہے۔ من ارتد فاقتلوہ۔ ایک علمی بحث ہے۔ بہر حال یہ رسالہ انگریز نے ضبط کر لیا۔ یہ دو بڑے متکلّم تھے جن کا آپس میں مکالمہ ہوا۔

علامہ محمد اقبالؒ اور قادیانیت

اب یہ بات بھی ہماری پھنس گئی۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو قتل کر کے آج کی دنیا میں ایک ریاست کیسے اپنا آغاز کرے گی۔ قادیانی لاکھوں کی تعداد میں تھے، اب بھی ہیں۔ کیا لاکھوں آدمیوں کا قتلِ عام ہو گا؟ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کا ایک حل علامہ اقبالؒ تجویز کر چکے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے قادیانیوں کو غیر مسلم، غدار اور یہودیت کا چربہ قرار دیا تھا۔ قادیانیت پر علامہ اقبال نے بہت کام کیا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو ان کی نفسیات کے مطابق اگر قادیانیت سمجھانی ہے تو اقبالؒ سے بہتر کوئی نہیں۔ یہ لوگ علماء کی اصطلاحات کو نہیں سمجھتے۔ آج کی سوشل اصطلاحات اور آج کے سماجی مسائل میں آج کے پڑھے لکھے لوگوں کو اگر قادیانیت سمجھانی ہے تو اس کے لیے اقبالؒ سے بہتر کوئی ہمارا نمائندہ نہیں ہے۔

علامہ اقبالؒ قادیانی ہوتے ہوتے بچے تھے اور واقف حضرات کا کہنا یہ ہے کہ انہیں بچانے والا مولوی انور شاہؒ ہے۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر قادیانیوں نے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے کی پلاننگ کی۔ کشمیر کے راجہ اور عوام کے درمیان تنازع کے ماحول میں کشمیر کمیٹی بنوائی۔ اس کمیٹی کے سربراہ علامہ اقبالؒ تھے۔ اس پر مسلمان علماء متوجہ ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور دوسرے علماء نے اقبالؒ سے کہا ارے خدا کے بندے! کیا کرنے لگے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے کچھ اشکالات ہیں۔ وہ اشکالات علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کی ملاقات سے دور ہوئے تو اقبال نے قادیانیوں کی کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور قادیانیوں کے خلاف خود مورچہ لگا کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اسلام سے قادیانیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر علامہ اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مکالمہ ہوا جو کہ بڑا زبردست

مکالمہ ہے۔ نہرو اقبال خط وکتابت چھپی ہوئی ہے۔ اصل انگریزی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی چھپا ہوا ہے۔ نہرو قادیانیوں کے حق میں بات کر رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ جب قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، حضرت محمد کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، کعبہ بھی یہی مانتے ہیں، تو پھر یہ مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ اس نے اقبالؒ سے کہا کہ تم بڑے تنگ نظر ہو گئے ہو۔ وہی جو آج کی دنیا کا سوال ہوتا ہے۔ ہم لوگ اقبالؒ کو صرف شعروں کے حوالے سے جانتے ہیں، ہمیں اقبالؒ کو ایک مفکر کے طور پر پڑھنا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ نے اس وقت انگریز حکومت کے سامنے تجویز رکھی کہ قادیانی غیر مسلم ہیں، ان کو مسلمان سوسائٹی کا حصہ سمجھنے کی بجائے غیر مسلم قوموں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ اقبالؒ نے حل دیا کہ قادیانیوں کو ایک مسلمان ریاست (جو بعد میں بنی) میں قتل کرنا شاید حالات کے تقاضے کے مطابق ٹھیک نہ ہو، لیکن غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مسلمان تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اسلامی ریاست میں جیسے دوسری اقلیتیں ہیں عیسائی، سکھ، یہودی وغیرہ، جو اُن کی حیثیت ہے وہی قادیانیوں کی حیثیت ہوگی۔

۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت

پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ایک اسلامی ریاست میں منکرینِ ختمِ نبوت کا معاشرتی سٹیٹس کیا ہوگا؟ کیا یہ قتل کیے جائیں گے یا ملک میں رہیں گے؟ غلام بنیں گے یا قیدی رہیں گے؟ ان کی معاشرتی حیثیت کیا ہوگی؟ اس پر علماء کرام نے متفقہ اجتہاد کر کے علامہ اقبالؒ کی تجویز کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء جنہوں نے بائیس نکات طے کیے تھے، انہوں نے کہا ہم اقبالؒ کی اس تجویز کو قبول کرتے ہیں۔ پاکستان میں قادیانیوں کو زندہ رہنے اور بسنے کا حق ہے، لیکن مسلمان کے طور پر نہیں، بلکہ غیر مسلم اقلیت کے طور پر انہیں پاکستان کا شہری تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں قادیانیت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو ۱۹۵۲ء میں علماء کرام اکٹھے ہوئے۔

۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کا پس منظر ایک تو یہ تھا کہ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان قادیانی بلکہ خوفناک قسم کا قادیانی تھا، اس نے دنیا بھر میں پاکستان کے جتنے سفارت خانے تھے سب قادیانی تبلیغ کے اڈے بنا دیے تھے۔ اس پر اس کی برطرفی کے مطالبے کے لیے علماء اکٹھے ہوئے، اور ساتھ ہی یہ مسئلہ پیش آ گیا کہ اسلامی ریاست میں ہم قادیانیوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ اس پر "کل جماعتی مجلسِ عمل تحفظِ

ختمِ نبوت" تشکیل پائی جو کہ انہی اکابر پر مشتمل تھی جنہوں نے بائیس نکات طے کیے تھے۔ اس کے سربراہ مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ چنے گئے جو بریلوی علماء میں بہت بڑے عالم تھے، لاہور کی وزیر خان مسجد کے خطیب تھے۔ لاہور میں داتا دربار کے ساتھ حزب الاحناف کا ادارہ بریلویوں کا پرانا ادارہ ہے۔ ان کے بعد مولانا ابوالبرکاتؒ اور علامہ محمود رضویؒ اور دیگر علماء کرام تھے۔ کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت نے دو مطالبات کیے۔

1. ایک یہ کہ پاکستان میں دستوری طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے،
2. اور دوسرا مطالبہ یہ کیا کہ ظفر اللہ خان کو وزارتِ خارجہ سے الگ کیا جائے۔

یہ دو بنیادی مطالبے تھے جس کے لیے تحریک چلی۔ تحریک کے نتیجے میں اس وقت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت تو قرار نہ دیا جا سکا لیکن خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے ان کی وزارت ختم ہو گئی تو ظفر اللہ خان ان کے ساتھ ہی چلا گیا اور اس سے جان چھوٹی۔

میں ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں پانچ سال کا تھا لیکن نعرے لگانے والوں میں شامل تھا۔ والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اس میں گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی گرفتاری کا منظر مجھے یاد ہے اور ان کی رہائی کا منظر بھی یاد ہے، وہ تقریباً ساڑھے نو دس مہینے ملتان جیل میں رہے۔ اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ بھی گرفتار ہوئے جو تقریباً چھ مہینے گوجرانوالہ اور دیگر مختلف جیلوں میں رہے۔ حضرت والد گرامیؒ کی ایک بڑی معرکۃ الآراء کتاب ہے "صرف ایک اسلام" وہ انہوں نے جیل میں لکھی تھی، جہاں کوئی لائبریری نہیں تھی، لیکن آپ نے جتنے حوالے دیے ہیں اپنی یادداشت سے دیے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ایک کتاب لکھی تھی دو اسلام (ایک حقیقی اسلام اور ایک مولوی کا اسلام) اس کے جواب میں انہوں نے کتاب لکھی "صرف ایک اسلام"۔ یعنی اسلام ایک ہی ہے وہی جو مولوی کا ہے۔ یہ معرکہ بھی ہمارے اکابر نے بڑی حکمتِ عملی، بڑے تدبر اور بڑی اجتہادی بصیرت کے ساتھ طے کیا۔

پاکستان بننے کے بعد ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے ابتدائی طور پر تین مرحلے درپیش آئے۔ ایک مرحلہ قراردادِ مقاصد کا، دوسرا مرحلہ بائیس نکات کا، اور تیسرا مرحلہ تحریک ختم نبوت کا۔ ان تین مراحل سے پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے علماء نے اپنا رخ متعیّن کر لیا اور پاکستان کی بنیادیں طے کر دیں۔ یہ تین واقعات ایسے ہیں جنہوں نے پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کا اور پاکستان کے آئندہ دستوری اور قانونی نظام کا رخ متعیّن کر دیا اور اس کی اساس طے کر دی۔ لیکن آگے عملاً کیا ہوا وہ الگ داستان ہے۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر

قومی سیاست کی تکون

اس کے بعد ایک نئی کشمکش شروع ہوگئی۔ جب قراردادِ مقاصد منظور ہوئی تو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خان مرحوم تھے جو مشرقی پاکستان سے دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہو کر آئے تھے اور فرید پور کے ضلع سے تھے۔ مجلس کے صدر تھے اور بہت سنجیدہ، فاضل اور دانشور آدمی تھے۔ قرارداد مقاصد کو منظور کروانے میں ان کا بہت کردار تھا۔ حتیٰ کہ آج کے سیکولر حلقے ابھی تک ان کے خلاف ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے مولوی تمیز الدین کے خلاف ایک مہم چلی کہ مولوی تمیز الدین نے دھاندلی سے قرارداد مقاصد منظور کروائی تھی۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ نہیں دھاندلی تو دوسرے لوگ کر رہے تھے۔ لیکن مولوی تمیز الدین کا پھڈا ملک کے فیڈرل کورٹ سے پڑ گیا۔ سپریم کورٹ بعد میں بنی ہے، وفاقی عدالت اس وقت فیڈرل کورٹ ہوتی تھی، جسٹس محمد منیر اس کے سربراہ تھے۔

پاکستان میں المیہ یہ ہوا کہ لیاقت علی خان مرحوم اور ناظم الدین مرحوم تک ملک کی قیادت سیاسی رہی ہے لیکن ناظم الدین مرحوم کے دور میں ہی بیوروکریسی ملک کی قیادت میں گھس آئی۔ غلام محمد بیوروکریٹ تھے، سکندر مرزا اور چوہدری محمد علی مرحوم بھی بیوروکریٹ تھے۔ جب سیاست میں بیوروکریسی گھسی تو معاملہ بگڑنا شروع ہوگیا۔ ۱۹۵۱ء/ ۱۹۵۲ء میں بیوروکریسی قومی سیاست میں گھسی تھی اور ۱۹۵۸ء میں فوج بھی سیاست میں گھس آئی تھی کہ جنرل ایوب خان صدر بنے۔ یہ بیوروکریسی اور فوج جب سیاست میں دخیل ہونا شروع ہوئے تو پاکستان کی سیاست اسٹیبلشمنٹ کی قیدی ہوگئی۔ تین طبقوں کا گٹھ جوڑ تب سے اب تک چلا آرہا ہے (۱) ملک کا اعلیٰ ترین کاروباری اور جاگیردار طبقہ، نواب، سردار وغیرہ (۲) بیوروکریٹ جو محکموں کے اعلیٰ حکمران ہیں (۳) اور جرنیل۔

یہ ایسی تکون قائم ہوئی ہے جس کا پہلا اظہار تب ہوا جب دستور ساز اسمبلی توڑی گئی۔ غلام محمد ملک کے گورنر جنرل تھے اور ناظم الدین مرحوم وزیراعظم تھے۔ ناظم الدین کی وزارت سے برطرفی کے بعد

غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ وہ دستور ساز اسمبلی جس نے قرارداد مقاصد پاس کی تھی اور اس کے مطابق ملک میں دستور کی تشکیل کے لیے کام کر رہی تھی، اسے غلام محمد نے گورنر جنرل کی حیثیت سے توڑ دیا۔ اس کو مولوی تمیز الدین خان نے فیڈرل کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ عوام کی منتخب اسمبلی ہے، گورنر جنرل کو اسے توڑنے کا اختیار نہیں ہے۔ جبکہ گورنر جنرل کا کہنا یہ تھا کہ میں چونکہ چیف ایڈمنسٹریٹر ہوں اس لیے مجھے اختیار ہے۔ یہاں سے ہمارے عدالتی اور دستوری جھگڑوں کا آغاز ہوا جو آج تک چل رہے ہیں۔

جسٹس محمد منیر نے مولوی تمیز الدین خان کی درخواست مسترد کر دی اور گورنر جنرل غلام محمد کا اقدام درست قرار دے دیا۔ یوں ہماری جمہوریت اور دستور سازی کی گاڑی پٹڑی سے اکھڑی اور پھر ۱۹۷۳ء میں جا کر ہم ٹریک پر چڑھے۔ یہ ۱۹۵۳ء/۱۹۵۴ء کی باتیں ہیں۔

۱۹۵۶ء کا دستور

اس کے دو سال بعد ۱۹۵۶ء میں چوہدری محمد علی وزیر اعظم بنے جو ذاتی طور پر شریف آدمی تھے اور اسلامی نظریہ کے حامل تھے مگر بہرحال بیوروکریٹ تھے۔ وزارتیں ٹوٹتی رہیں، بنتی رہیں، کبھی کوئی پارٹی آئی، کبھی کوئی آئی۔ چوہدری محمد علی وزیر اعظم بنے تو انہوں نے ۱۹۵۶ء میں نئی دستور ساز اسمبلی سے ایک دستور منظور کروایا جو ۱۹۵۶ء کا دستور کہلاتا ہے۔ اس میں ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دیا اور یہ پابندی عائد کی کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف دستور سازی نہیں کر سکے گی۔ اس میں کچھ اور چیزیں بھی شامل تھیں۔

۱۹۵۶ء کے دستور کا ایک بڑا کارنامہ صحیح یا غلط یہ تھا کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی صوبائیت ختم کر کے ون یونٹ بنا دیا۔ الگ الگ حیثیت ختم کر کے اِدھر مغربی پاکستان کے نام سے ایک صوبہ بنا دیا، اور مشرقی پاکستان مشرقی بنگال دوسرا صوبہ تھا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی تقسیم ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ اس پر ملک کے دونوں خطوں میں اقتدار اور اختیارات کی سیاسی کشمکش چلتی رہی۔

۱۹۵۸ء میں معاملات زیادہ بگڑے تو کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور فیروز خان نون کی حکومت برطرف کر دی۔ سکندر مرزا ملک کے صدر تھے، ان کے ساتھ دو چار دن چلتے رہے پھر ان کو بھی چھٹی کرا دی۔ مارشل لاء ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک چار سال رہا۔

۱۹۶۲ء کا دستور

جنرل محمد ایوب خان نے ملک کا چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور صدر پاکستان بن کر ایک نیا آئین دیا جو کہ ۱۹۶۲ء کا آئین کہلاتا ہے۔ اس سے پہلے عبوری آئین تھا جس کا ایک بڑا ''کارنامہ'' یہ تھا کہ ملک کے نام سے اسلام کا لفظ حذف کر دیا اور جمہوریہ پاکستان نام کر دیا۔ جسٹس محمد منیر جس کا اوپر ذکر ہوا، یہ ایوب خان کا وزیر قانون تھا اور ساری سیکولرلابی آگئی تھی۔ اس پر ملک میں خاصا شور مچا، ملک میں جلسے جلوس ہوئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان نام رہنا چاہیے، اسلامی کا لفظ ختم نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارے ایک شاعر ہوتے تھے سعید علی ضیاء مرحوم و مغفور، ان کی ایک نظم بڑی مقبول ہوئی جو عموماً جلسوں میں پڑھی جاتی تھی ہم بھی پڑھا کرتے تھے، اس کا ایک مصرع ہے ؏ ''ملک سے نام اسلام کا غائب، مرکز ہے اسلام آباد''۔ چونکہ انہی دنوں اسلام آباد بنا تھا، اس سے پہلے پاکستان کا دارالحکومت کراچی ہوتا تھا۔ کراچی جغرافیائی اور دفاعی اعتبار سے موزوں نہیں تھا تو دارالحکومت کے لیے متبادل جگہ جوہر آباد طے ہوئی۔ خوشاب کے ساتھ جوہر آباد نیا شہر دارالحکومت کے لیے بسایا گیا، مولانا محمد علی جوہر کے نام پر اس کا نام رکھا گیا اور ایک دفعہ فیصلہ ہو گیا کہ چونکہ یہ ملک کے وسط میں ہے، اس لیے ملک کا نیا دارالحکومت جوہر آباد ہو گا۔ لیکن جب ایوب خان صدر بنے تو انہوں نے یہ فیصلہ تبدیل کر کے مارگلہ کی پہاڑیوں میں اسلام آباد کے نام سے نیا دارالحکومت بنایا۔ اس وقت ایک طرف یہ کہ دستور سے اسلام کا لفظ ختم کر دیا اور دوسری طرف ملک کا دارالحکومت اسلام آباد بنایا تو اس پر یہ شعر مشہور ہے

ملک سے نام اسلام کا غائب مرکز ہے اسلام آباد
پاک حکمران زندہ باد پاک حکمران زندہ باد

لیکن جب ۱۹۶۲ء کا باقاعدہ دستور آیا تو پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان واپس لینا پڑا اور اس میں کچھ دفعات رکھنی پڑیں کہ یہ اسلامی ریاست ہے۔

اس کے بعد ۱۹۷۳ء کا دستور کیسے بنا؟ اس میں کون کون شریک تھے؟ کیا ہوا اور کن مراحل سے گزرے؟ یہ الگ داستان ہے۔

نفاذِ اسلام اور پارلیمنٹ

اس کے بعد پاکستان میں جب شریعت کے عملی نفاذ کا مطالبہ شروع ہوا تو یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اگر شریعت نافذ کرنی ہے تو کسی چیز کے شریعت ہونے یا نہ ہونے میں فیصلے کی اتھارٹی کون ہوگی؟ یہ بنیادی جھگڑا چلتا رہا ہے۔ بات اصولی طور پر ٹھیک ہے کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ ہونا چاہیے اور پاکستان میں شریعت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اصول میں لکھا ہوا ہے اور دستور میں گارنٹی دی گئی ہے کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں کرے گی اور پاکستان میں قرآن و سنت کے احکام نافذ کیے جائیں گے بالخصوص عدالتوں میں۔ لیکن یہ بنیادی جھگڑے کی بات باقی رہی کہ کون سی بات شریعت کی ہے اور کون سی نہیں؟ کون سا قانون شریعت کے مطابق ہے اور کون سا شریعت کے خلاف ہے؟ دستوری نظام میں اس کا فیصلہ کرنے کی اتھارٹی کون ہوگی؟ آخر کوئی تو فائنل اتھارٹی ہوگی جس کا فیصلہ نافذ ہو جائے کہ جس کے بعد بحث اور دلیل کی گنجائش باقی نہ رہے، اس کے بغیر نظام نہیں چلے گا۔

پارلیمنٹ کیلئے شریعت کی تعبیر و تشریح کا اختیار

جدید قانون دان حضرات اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ یہ اتھارٹی پارلیمنٹ کو دے دی جائے۔ قرآن و سنت اور شریعت کی تعبیر اور کسی چیز کے شرعی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت جو فیصلہ کر دے وہ ٹھیک ہے وہی شریعت ہے، اور جدھر اقلیت ہو وہ قانون ختم ہو جائے۔ یہ بہت لمبی اور بہت گہری بحث ہے جو کہ طویل عرصے سے چلی آ رہی ہے اور اس کشمکش اور بحث نے بہت سے خیر کے کاموں کا راستہ روکا ہوا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل، اس سے پہلے اسلامی مشاورتی کونسل، اور اس سے پہلے ادارہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ اس مقصد کے لیے بنا تھا کہ علماء اور جدید قانون دان ماہرین کا ایک مشترکہ فورم ہو گا جو پارلیمنٹ کی رہنمائی کرے گا کہ کون سا قانون شریعت کے مطابق ہے اور کون سا شریعت کے مطابق

نہیں۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ جو ہمارے اکابر اور تحریکِ پاکستان کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے، انہوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی میٹنگ تھی جس میں جسٹس صاحبان بھی تھے اور ہم بھی تھے۔ یہ کشمکش زیر بحث تھی کہ شریعت کے طے کرنے کی اتھارٹی کون ہے۔ آپ کو تعبیرات کے فرق کا علم ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیرات جدید دانشور کیا کر رہے ہیں؟ اور ہماری قدیم اجتماعی اور روایتی تشریح و تعبیر جو چلی آ رہی ہے جس پر ہم قائم ہیں وہ مختلف ہے۔ مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بحث ذرا آگے بڑھی تو میں نے چیئرمین جسٹس صاحب سے کہا کہ دو تین میٹنگوں میں بات سمجھ میں آگئی ہے۔ پاکستان کو جس طرف آپ لے جانا چاہ رہے ہیں میں نہیں جانے دوں گا، اور جس طرف میں لے جانا چاہ رہا ہوں آپ نہیں جانے دیں گے۔ یہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک وہیں کھڑی ہے، ستر سال ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ہمارا ایک بڑا جھگڑا پارلیمنٹ کی خود مختاری کے حوالے سے ہے کہ پارلیمنٹ کو تعبیر اور تشریح کا حق دے دیا جائے۔ اس پر شریعت بل کی تحریک کے دوران ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ وفاقی وزیر قانون اور وفاقی وزیر مذہبی امور کے ساتھ چل رہا تھا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ قرآن و سنت کو سپریم لاء یعنی بالادست اور بالاتر قانون قرار دیا جائے، اور ملک میں جو قانون، رسم و رواج، یا ضابطہ قرآن و سنت کے متصادم ہے وہ ختم ہو جائے۔ مذاکرات میں بنیادی نکتہ یہ تھا کہ قرآن و سنت کی بالادستی تو ہم تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن قرآن و سنت کی تعبیر اور تشریح کی اتھارٹی کون ہوگی؟ پارلیمنٹ خود اتھارٹی ہوگی یا اسے کسی اور سے تشریح لینی ہوگی۔ یہ بڑا پرانا جھگڑا ہے جو پاکستان بننے کے بعد سے چلا آ رہا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہے تو یہ فیصلہ کرنا کہ یہ اسلام ہے اور یہ اسلام نہیں ہے، اس میں اتھارٹی کون ہوگی؟

اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت

اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی تھی کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کی پابند ہوگی اور اس کی رہنمائی اسلامی نظریاتی کونسل کرے گی۔ یہ کونسل تمام مکاتبِ فکر کے ذمہ دار نمائندہ علماء کرام پر مشتمل ہوگی اور ان کے ساتھ ملک کے ممتاز قانون دان ماہرین ہوں گے۔ کونسل کو مسائل بھیجے جائیں گے اور وہ کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کی سفارش کرے گی، جس کی بنیاد پر پارلیمنٹ قانون سازی کرے گی۔ یہ ایک درمیان

کا راستہ نکالا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کی قوتِ تنفیذ بھی متاثر نہ ہو اور قرآن و سنت کے احکام کی تشریح و تعبیر بھی علماء کے ذریعے ہو۔

اس کے بعد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی تو اس کا بنیادی کام بھی یہ ہے کہ وہ کسی قانون کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس میں بھی مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور جج صاحبان مشترک طور پر حصہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کچھ وسیع اختیارات مل گئے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا کام محض سفارش ہے لیکن وفاقی شرعی عدالت کو محدود طور پر فیصلوں کا اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ کسی قانون کو ختم بھی کر سکتی ہے۔

چنانچہ ہمارے ملک کے دستور میں یہ دو ادارے اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت اس کام کے لیے ہیں کہ وہ کسی قانون کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ دیں۔ وہ سفارش کے درجے میں ہو یا فیصلے کے درجے میں، پارلیمنٹ اس کو منظور کرے اور وہ نافذ ہو جائے۔ یہ دو ادارے ہیں بہت سے معاملات میں فیصلہ کر چکے ہیں، البتہ فیصلوں پر عملدرآمد کا مرحلہ بہت مشکل ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے مسلسل کام کر کے اور ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر ایک جامع رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کر رکھی ہے کہ فلاں قانون میں فلاں شق قرآن و سنت سے متصادم ہے اس کو ختم کر کے یہ شق آنی چاہیے۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور تجاویز کا تعلق ہے اس میں کوئی خلا نہیں ہے۔ کم و بیش ملک میں موجود ہر قانون کے بارے میں ایک واضح رائے موجود ہے، اور متبادل قانون بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس کی بجائے یہ قانون ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ اس کی حیثیت سفارش کی ہے، باوجودیکہ دستور میں لکھا ہوا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل جو سفارشات پیش کرے گی، حکومت انہیں قانون سازی کے لیے متعلقہ اسمبلی میں پیش کرنے کی پابند ہے، وفاقی معاملات میں وفاقی حکومت اور صوبائی معاملات میں صوبائی حکومتیں پابند ہیں کہ وہ کونسل کو سفارشات اسمبلی میں پیش کر کے قانون کی شکل دیں، یہ قانون اور ضابطہ تو موجود ہے لیکن ایسے ہوتا نہیں ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کام تو کر رہی ہے لیکن وہ عمل میں نہیں آ رہا، اور وفاقی شرعی عدالت کو فیصلے کرنے کا اختیار تو ہے وہ فیصلہ کرتی بھی ہے لیکن اس کے فیصلوں پر عملدرآمد میں رکاوٹ یہ ہے کہ وہ سپریم کورٹ میں اپیل ہونے کے بعد ''فریزر'' میں لگ جاتے ہیں۔ کئی فیصلوں کے خلاف وفاقی شرعی

عدالت کی رٹ درخواستیں سپریم کورٹ میں موجود ہیں، جب حکومت کی پالیسی طے ہوتی ہے تو وہ ان کو نکالتے ہیں، ورنہ وہی پڑی رہتی ہیں۔

آج کا اسلوب اور ہمارے علماء کرام

یہ بات سمجھنی چاہیے کہ قانون اور دستور کی زبان بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارا دینی حلقہ قانون اور دستور کی زبان اور باریکیوں کو نہیں سمجھتا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ اس مسئلے پر کہ ''قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہوں گے'' اس میں وہ اضافہ چاہتے تھے کہ ''قرآن و سنت ملک کا سب سے بڑا سورس آف لاء ہوں گے''یعنی قانون سازی کا سرچشمہ اور ذریعہ ہوں گے۔ ایک عام آدمی سے بات کریں تو وہ کہے گا کہ یہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں یہ کون سی غلط بات ہے۔ لیکن ہمارا مطالبہ تھا کہ قرآن و سنت سورس آف لاء نہیں ہوں گے، خود ان کے جو احکام ہیں وہ نافذ ہوں گے، ان کی روشنی میں ہم اس کا خلاصہ نہیں نکالیں گے۔ سورس آف لاء کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی ہم خود کریں گے۔ اور ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ قرآن و سنت خود لاء ہے۔

ہم عام طور پر دستور اور قانون کی زبان نہیں سمجھتے، اسی المیہ کے حوالے سے ایک بات اور ذکر کرنا چاہوں گا جو تاریخ کا حصہ ہے۔ مولانا صوفی محمد نے جب مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ شریعت کی تحریک چلائی، اس کے نتیجے میں نفاذِ شریعت ریگولیشن جاری ہوا جو معاہدے کے تحت نافذ ہوا۔ میں اس وقت متحدہ شریعت محاذ پاکستان کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا۔ میں نے وہاں کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے خود سوات کا دورہ کیا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے۔ جس دن میں راولپنڈی پیر ودھائی سے بس پر بیٹھا، اس دن کے نوائے وقت نے اس ریگولیشن کا اردو ترجمہ چھاپا تھا جو میں نے راولپنڈی سے جاتے ہوئے راستے میں پڑھا۔ چونکہ اس میدان میں مجھے بھی پچاس سال ہوگئے ہیں اس لیے تھوڑا بہت دستور و قانون کی زبان کو سمجھتا ہوں کہ جملہ کیا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ ریگولیشن پڑھ کر میں نے سر پکڑ لیا کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں تھا، انہوں نے صرف اصطلاحات بدلی تھیں کہ سیشن جج اب ضلع قاضی کہلائے گا اور سول جج تحصیل قاضی کہلائے گا۔ سوات پہنچا، وہاں مولانا قاری عبد الباعثؒ میرے دوست تھے جو کہ ایم این اے رہے ہیں، سیدو شریف میں مسجد کے خطیب تھے، میں ان کے پاس ٹھہرا اور ان سے کہا کہ خدا کے بندو! آپ لوگوں نے یہ کیا نافذ کیا ہے؟ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تھوڑا بہت اصطلاحات کا فرق ہے۔ میں نے کہا البتہ ایک فرق ہوا ہے

کہ وہ عائلی قوانین جو سارے ملک میں متنازع چلے آرہے ہیں اور پہلے یہاں نافذ نہیں تھے، اب آپ نے اس معاہدے کے ذریعے ان کو یہاں بھی نافذ کروا دیا ہے۔ میں نے انہیں وہ شق پڑھ کر سنائی کہ یہ عائلی قوانین جس پر ہمارے علماء سالہا سال سے لڑتے چلے آرہے ہیں، وہ اس سے پہلے مالاکنڈ ڈویژن کے علاقے میں نافذ نہیں تھے، اب آپ نے اس پر دستخط کر دیے ہیں اور وہ یہاں بھی نافذ ہو گئے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ یہ معاہدہ آپ نے پڑھا نہیں تھا، ویسے ہی سب نے دستخط کر دیے؟ تو وہ کہنے لگے کہ وہ معاہدہ انگریزی میں تھا، چیف سیکرٹری نے کہا تھا کہ اس میں آپ کے سارے مطالبے لکھے ہوئے ہیں، تو ہم نے دستخط کر دیے۔ میں نے کہا خدا کے بندے! چیف سیکرٹری تو فریق ثانی ہے۔ میں نے کہا، یہاں ہائی کورٹ کے وکلاء میں آپ کو کوئی دیندار وکیل نہیں ملا جس کو آپ ساتھ ملاتے اور اس سے پڑھوا لیتے کہ یہ کیا لکھا ہوا ہے؟ یا چلو چھوڑیں وکیل کو، قانون کی زبان سمجھنے والے علماء بھی ہیں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا سمیع الحق، یا مولانا قاضی عبداللطیف سے پڑھوا لیتے۔ یہ قانون کی زبان سمجھتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ سیکرٹری نے کہا تھا ہم نے اس میں آپ کی شریعت نافذ کر دی ہے، تو ہم نے دستخط کر دیے۔

ایک اور المیہ ذکر کرتا ہوں، میں خود اس میں مبتلا رہا ہوں اور اب بھی کسی حد تک شریک ہوں۔ میں نے ساری صورتحال معلوم کرنے کے لیے دو آدمیوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے اس وقت ڈی آئی جی پولیس ہمارے وزیر آباد کے تھے، ہمارا علاقائی تعلق تھا، میں گکھڑ کا ہوں اور تحصیل وزیر آباد ہی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس حوالے سے ان سے ملتا ہوں اور ان سے صورتحال معلوم کرتا ہوں کہ کیا ہوا ہے؟ میں نے پیغام بھیجا، وہ بڑے خوش ہوئے، انہوں نے بلایا اور وہاں کی صورتحال بتائی کہ یہ ہوا ہے، ایسے ہوا ہے۔ میں نے تفصیلی رپورٹ لکھی تھی جو چھپ چکی ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہائی کورٹ کے دو تین وکیل جو دیندار اچھے وکیل ہوں ان سے ملنا چاہیے۔ پشاور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل بشیر حسین تھے، میں ان سے ملا، تعارف کروایا، غائبانہ طور پر اخبارات کے ذریعے وہ مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا، میں آپ کے پاس شکوہ لے کر آیا ہوں کہ آپ کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور شریعت بھی چاہتے ہیں، آپ کے ساتھ اور وکلاء بھی ہوں گے۔ انہوں نے کہا جی ہمارا پورا گروپ ہے۔ میں نے کہا، آپ حضرات علماء کرام کے ساتھ مل کر یہ تکلف نہیں کر سکے کہ آپ ان کو گائیڈ کریں کہ قانون کی زبان یہ ہے، آپ ان کے ساتھ ملیں، تحریک میں شریک ہوں اور ان سے

کہیں کہ ہماری خدمات حاضر ہیں۔ یقین جانیے میرے کہنے پر وہ رونے لگ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم علماء کرام کے پاس گئے تھے، ہم نے اپنی خدمات پیش کی تھیں، لیکن تحریکِ نفاذِ شریعت کی شوریٰ کی طرف سے ہمیں یہ کہا گیا کہ آپ کی ضرورت نہیں ہے، یہ علماء کا کام ہے، آپ کا کام نہیں ہے۔ ہماری اپنی صورتحال یہ ہے، چنانچہ جو کچھ ہوا، سو ہوا۔

نفاذِ اسلام اور عدلیہ

''قراردادِ مقاصد'' میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے، حکومت کا حق عوام کے منتخب نمائندوں کو ہے، اور پارلیمنٹ اور حکومت قرآن و سنت کی پابند ہیں۔ قراردادِ مقاصد دستور میں چلی آرہی تھیں لیکن اس کے دیباچے کے طور پر۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اپنے اختیارات استعمال کیے اور جو دو چار اچھے کام کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اس کو دیباچے سے نکال کر اصل دستور میں شامل کر دیا اور اس پر عملدرآمد لازم ہو گیا۔

دستور میں قراردادِ مقاصد کی بالادستی کا معاملہ

اس کے بعد عدالتوں میں بہت سے قوانین چیلنج ہونے لگے کہ دستور میں لکھا ہوا ہے کہ قرآن و سنت بالادست ہیں اور فلاں قانون قرآن و سنت سے متصادم ہے لہٰذا عدالت اس کو ختم کرے۔ اس پر درجنوں کیس ہیں، مثال کے طور پر ایک کا حوالہ دیتا ہوں کہ قاتل کو اگر قصاص کی سزا ہو جائے تو شرعاً اسے معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کا ہے، اگر وہ معاف نہ کریں تو کسی اور کو معاف کرنے کا اختیار شرعاً نہیں ہے۔ جبکہ ہمارے ملک میں صدر مملکت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کی کوئی بھی سزا کالعدم کر سکتے ہیں، چنانچہ صدر کے پاس جب رحم کی اپیل جاتی ہے تو صدر کی مرضی ہے قبول کرے یا نہ کرے۔ صدر کا یہ اختیار قصاص کی حد تک شریعت سے متصادم ہے۔

لاہور ہائی کورٹ میں یہ چیلنج ہو گیا، کوئی کیس تھا، اس میں قاتل کو سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ اس نے صدر کے پاس معافی کی اپیل دائر کی تو مخالف فریق نے اپنے کیس میں یہ موقف اختیار کیا کہ صدر کو یہ سزا معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے کیونکہ دستور میں لکھا ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ''حاکم علی کیس'' کہلاتا ہے۔ چنانچہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ قرارداد مقاصد میں قرآن و سنت کو بالادستی دی گئی ہے، اس لیے جو قانون یا دستور کی جو شق قرآن و سنت سے متصادم ہو گی وہ کالعدم ہو جائے گی، اور صدر کا یہ اختیار چونکہ قرآن اور سنت سے متصادم ہے اس لیے ختم

ہے۔

صدر کا یہ اختیار لاہور ہائی کورٹ نے ختم کر دیا تو اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر ہوئی اور چیف جسٹس نسیم حسن شاہ مرحوم کی سربراہی میں فل بینچ بیٹھا۔ سپریم کورٹ میں کیس زیر بحث نہیں آتے، نکات پر بحث ہوتی ہے۔ وہاں یہ نکتہ زیر بحث آیا کہ ٹھیک ہے قراردادِ مقاصد دستور کا حصہ تو ہے اور اس پر عمل بھی ضروری ہے، لیکن اگر دستور ہی کی کوئی دوسری شق قراردادِ مقاصد سے متصادم ہوگی تو کیا قرارداد مقاصد کو دستور کی باقی شقوں پر بالادستی حاصل ہے یا نہیں؟ اگر قرارداد مقاصد کو دستور کی باقی شقوں پر بالادستی حاصل نہیں ہے تو یہ تعارض ہے۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ اِس پر عمل کرنا ہے یا اُس پر عمل کرنا ہے۔ سپریم کورٹ کے فل بینچ نے اس پر بحث کی کہ اگر قراردادِ مقاصد کو دستور کی باقی دفعات پر بالادستی حاصل ہے تو ہائی کورٹ کا فیصلہ درست ہے، اور اگر اس کو بالادستی نہیں ہے تو صدر کا اختیار درست ہے۔ سپریم کورٹ کے فل بینچ نے یہ فیصلہ دیا جو آج بھی قانون کا حصہ ہے کہ قراردادِ مقاصد دستور کا حصہ تو ہے لیکن اس کو دستور کی باقی شقوں پر بالادستی حاصل نہیں ہے۔ اگر قراردادِ مقاصد اور دستور کی باقی شقوں میں کچھ تعارض ہوگا تو قراردادِ مقاصد فیصل اور حکم نہیں ہوگی، فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ یہ کہہ کر سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کا فیصلہ کینسل کر دیا۔

قرآن و سنت یا انسانی حقوق کا چارٹر؟

ہمارے ہاں ایک مرحلے پر سپریم کورٹ میں یہ نکتہ بھی زیر بحث آیا کہ چکوال کا ڈکیتی اور قتل کا ایک کیس تھا، اس میں عدالت نے حکم دیا تھا کہ مجرم کو سرعام پھانسی دی جائے۔ انسانی حقوق کا جو بین الاقوامی فریم ورک ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو کھلے بندوں پھانسی نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ عزتِ نفس کے خلاف ہے اس لیے انسانی حقوق کے خلاف ہے۔ سپریم کورٹ میں کیس پیش ہوگیا اور یہ نکتہ زیر بحث تھا کہ اگر قرآن پاک کا کوئی حکم آج کے انسانی حقوق کے چارٹر سے متصادم ہو تو ہم کس پر عمل کریں گے؟ اِس پر عمل کریں گے یا اُس پر عمل کریں گے؟ کیونکہ دستورِ پاکستان میں یہ بھی گارنٹی دی گئی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں ہوگا، اور دستور پاکستان میں یہ بھی گارنٹی دی گئی ہے کہ انسانی حقوق کے خلاف کوئی قانون نہیں ہوگا۔ یہ دو گارنٹیاں بیک وقت موجود ہیں۔ انسانی حقوق سے مراد وہ ہے جو موجودہ دنیا کا تصور ہے۔

ہمارے ایک بہت بڑے محترم فاضل قانون دان نے تین دن اس پر بحث کی اور کہا کہ قرآن پاک

ہمیں یہ کہتا ہے کہ ہم نے اس پر نہیں بلکہ انسانی حقوق کے چارٹر پر عمل کرنا ہے۔ اس پر انہوں نے دلیل یہ دی کہ قرآن پاک کہتا ہے "یایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود" کہ ایمان والو! معاہدات کی پابندی کرو۔ اور یہ انسانی حقوق کا چارٹر ہمارا معاہدہ ہے، اس پر ہمارے دستخط ہیں، اس لیے قرآن پاک کا اپنا تقاضہ یہ ہے کہ ہم قرآن پر عمل نہ کریں بلکہ اُس پر عمل کریں۔ انہوں نے دوسری دلیل یہ دی کہ قرآن پاک ہمیں معاملات عرف پر چلانے کا حکم دیتا ہے، اور آج کا عالمی عرف انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ اگر قرآن پاک کے کسی حکم کا اور انسانی حقوق کا کوئی تعارض ہوگا تو ہم آج کے عرف اور معاہدات پر عمل کریں گے۔

وفاقی شرعی عدالت اور اس کا اختیار

شریعت کے نفاذ، شریعت کے احکام اور قوانین کی عملداری، اور شریعت کے خلاف قوانین کی منسوخی کے مختلف دائروں میں جو محنت ہوتی رہی، اس حوالے سے ایک دائرہ اور ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ ایک نئی عدالت ''وفاقی شرعی عدالت'' بنائی جو کہ اب بھی موجود ہے۔ علماء کرام اور جج صاحبان یعنی قدیم قانون کے ماہرین اور جدید قانون کے ماہرین پر مشتمل مشترکہ وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی، جس کا کام یہ ہے کہ ملک کا کوئی شہری ملک کے کسی قانون کو قرآن و سنت سے متصادم سمجھتا ہے تو وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کرے۔ وفاقی شرعی عدالت اگر اس درخواست پر مطمئن ہو جائے کہ یہ واقعتاً قرآن و سنت سے متصادم ہے تو اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ حکومت کو اس قانون کو ختم کرنے کا حکم دے گی کہ اتنے عرصے میں اس کو ختم کر کے متبادل قانون نافذ کیا جائے۔ اگر اتنے عرصے میں حکومت اسے ختم نہیں کرے گی تو وہ قانون خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اور متبادل میں بھی وفاقی شرعی عدالت رہنمائی کرے گی کہ یوں تبدیل کیا جائے۔ یعنی یہ اتھارٹی اور فیصلہ ہے، سفارش نہیں ہے۔

میں اس کی مثال عرض کرتا ہوں۔ انگریزوں کے دور میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین جرم تھا اور اس کی سزا تین سال قید مقرر تھی۔ بعد میں پاکستان کی پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو انہوں نے سزا میں اضافہ کر دیا اور دس سال سزا مقرر کی۔ پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج ہو گیا کہ شریعت میں توہینِ رسالت کی سزا قید نہیں ہے بلکہ قتل اور موت ہے۔ اسماعیل قریشی ہمارے وکیل ہیں انہوں نے چیلنج کر دیا، چنانچہ وفاقی شرعی عدالت نے یہ بات تسلیم

کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو آرڈر کیا کہ اسے شریعت کے مطابق تبدیل کیا جائے، اس پر پارلیمنٹ کو دوبارہ غور کر کے یہ فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔

یہ میں نے اس وضاحت کے لیے ذکر کیا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کا مقصد اور دائرہ کار کیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے بڑے بڑے فیصلے کیے ہیں، لیکن اس کے بعض فیصلے ہماری اسٹیبلشمنٹ کی مخصوص تکنیک کی نذر بھی ہوئے ہیں اور سپریم کورٹ کے ''فریزر'' میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سودی قوانین کا مسئلہ ہے۔ سودی قوانین وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج ہو گئے کہ ملک کے معاشی قوانین میں فلاں فلاں قانون سودی ہے اور شریعت سے متصادم ہے، انہیں ختم کیا جائے۔ وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دے دیا اور حکومت کو آرڈر دے دیا کہ ان قوانین کو تبدیل کیا جائے، وہ بحث ابھی تک چل رہی ہے۔

نفاذِ اسلام کی جدوجہد

پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کن معاملات اور کن مراحل سے گزری۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب پاکستان بنا تو اس میں شامل بہت سی ریاستوں میں عدالتی دائرے میں قوانین نافذ تھے۔ پاکستان میں ریاست سوات، دیر، چترال، ریاست امبھ، خیرپور، بہاولپور، قلات یہ بہت بڑا علاقہ تھا جو ریاستوں پر مشتمل تھا۔

تاج برطانیہ کے دور میں علاقائی ریاستوں کی حیثیت

انگریزی دور میں برصغیر میں سینکڑوں ریاستیں تھیں۔ ان ریاستوں کا الگ نظام تھا اور اسٹیبلشڈ ایریا کا نظام الگ تھا۔ اسٹیبلشڈ ایریا وہ علاقہ کہلاتا تھا جو برطانوی حکومت کے براہ راست کنٹرول میں تھا۔ پنجاب، یوپی اور بنگال میں براہ راست تاجِ برطانیہ کی حکومت تھی۔ لیکن سینکڑوں علاقائی ریاستیں ایسی تھیں جن کے ساتھ برطانوی حکومت نے یہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ اندرونی طور پر ان کے نواب اور سردار خود مختار ہیں، وہ نظام جس طرح بھی چلانا چاہیں چلائیں، برطانوی حکومت کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن ایک مرکزی وفاقی نظام ہوگا اس میں وہ پابند ہوں گے۔ دفاع، امن وامان، کرنسی اور مواصلات وغیرہ، ان علاقوں میں مشترک مسائل میں مرکزی حکومت کی پالیسی چلتی تھی، لیکن داخلی مسائل کہ قانون کیا ہے، ضابطہ کیا ہے، اندرونی طور پر حکومت کا نظام کیا ہے، شورائی ہے یا نہیں ہے، انہیں یہ خود مختاری حاصل تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب یہاں سے انگریز گیا تو جنوبی ایشیا میں اس قسم کی پانچ سو کے لگ بھگ ریاستیں تھیں، کچھ چھوٹی اور کچھ بڑی۔ قلات کی ریاست بہت بڑی تھی، اس میں آدھا بلوچستان تھا۔ ریاست خیرپور الگ ریاست تھی، اس میں سندھ کا بہت بڑا حصہ تھا، اسی طرح کشمیر اور جوناگڑھ۔ اس طرح کی بہت سی نیم خود مختار ریاستیں تھیں۔ کشمیر کا جھگڑا ابھی اس لیے کھڑا ہوا تھا کہ جب تقسیم ہوئی تو طے یہ ہوا کہ جو ہندو اکثریت کے علاقے ہیں وہ انڈیا کے ساتھ، اور جو مسلم اکثریت کے علاقے ہیں وہ پاکستان کے

ساتھ شامل ہوں گے۔ مگر ریاستوں کے حکمرانوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ جس کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، وہ خود مختار ہیں۔ اس حوالے سے بڑی دلچسپ داستانیں ہیں۔ کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ تھا لیکن اس کا راجہ مسلمان نہیں تھا، غیر مسلم تھا، اس نے انڈیا کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ جونا گڑھ ہندو ریاست تھی وہاں ہندو راجہ تھا، اس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ یہ عجیب قصہ تھا۔ قلات مسلمان ریاست تھی، یہ بھی انڈیا کے ساتھ الحاق کرتے کرتے رہ گئے اور بچ گئے۔ لیکن بہر حال ریاستوں کے حکمرانوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔ کشمیر کے راجہ نے انڈیا کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تو مسلمان عوام نے بغاوت کر دی کہ ہم پاکستان کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ پاکستان سے فوجیں کشمیر میں داخل ہوئیں تو اقوام متحدہ نے لڑائی رکوا دی۔ کشمیر میں وہی جھگڑا ابھی تک چل رہا ہے۔ حیدر آباد دکن کی ریاست مسلمان حکومت تھی، وہاں مسلمان نواب تھے جو پاکستان کے ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن انڈیا نے فوجیں بھیج کر اس پر قبضہ کر لیا اور جونا گڑھ پر بھی قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۵ء کا شریعت بل

"شریعت بل" یعنی شریعت کے نفاذ کے لیے مسودۂ قانون، اس نام سے جدوجہد کا آغاز انگریزوں کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب برطانوی استعمار نے یہاں داخلی خود مختاری دے کر ریاستوں کے انتخابات کروائے تھے اور صوبائی حکومتیں قائم ہوئی تھیں، اس زمانے میں جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ نے مل کر پہلا انتخاب لڑا تھا۔ پورے برصغیر میں بہت سے صوبوں میں مسلم لیگ کی حکومتیں بنی تھیں اور بہت سے صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت بنی تھی، جمعیت علماء ہند بھی اس وقت کانگریس کے ساتھ تھی اور صوبہ سرحد اسمبلی میں جمعیت علماء ہند کے نمائندے ٹانک اور کلاچی کے علاقے سے منتخب ہوئے۔

اس وقت جمعیت علماء ہند نے صوبہ سرحد میں یہ تحریک کی تھی کہ وراثت کی شرعی تقسیم کا قانون نافذ ہونا چاہیے۔ چونکہ پنجاب کے زمینداروں، سندھ کے جاگیرداروں، صوبہ سرحد کے بڑے خانوں اور بلوچستان کے سرداروں میں یہ علاقائی رواج چلا رہا تھا کہ عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا، اور لڑکوں میں سے بھی بڑا لڑکا وارث ہوتا تھا۔ اب بھی تقریباً جاگیرداری اور سرداری سسٹم میں یہی معاملہ ہے۔ چنانچہ برصغیر میں عورتوں کے وراثتی حقوق کی بحالی کے لیے سب سے پہلے جمعیت علماء ہند نے

۱۹۳۵ء کے الیکشن کے بعد صوبہ سرحد میں شریعت بل کے نام سے ایک بل پیش کیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ روایتی طریقہ ختم کرکے شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم کا نظام رائج کیا جائے۔ اس زمانے میں سرحد میں بھی عورتوں کی وراثت اور ان کی مالی ملکیت کے استحقاق کا یہ کام ہوا۔ اور پنجاب اور یوپی (اترپردیش) میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے عوامی سطح پر یہ مہم چلائی تھی کہ لوگوں کو وراثت کی تقسیم شریعت کے مطابق کرنی چاہیے اور عورتوں، لڑکیوں، بہنوں اور بیویوں کو وراثت میں حصہ دینا چاہیے۔ سرحد میں یہ تحریک اسمبلی میں تھی اور پنجاب میں یہ تحریک عوامی وعظ و نصیحت کے ذریعے تھی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ کو، جو مولانا مفتی عبدالشکور ترمذیؒ کے والد تھے، باقاعدہ مہم دے کر پنجاب کے مختلف علاقوں میں بھیجا تھا۔ جبکہ اِدھر سرحد اسمبلی میں یہ بل پیش ہوا جس کا نام شریعت بل تھا، اس میں تقاضہ کیا گیا تھا کہ قانوناً پابندی لگا دی جائے کہ وراثت کی تقسیم شریعت کے مطابق ہو اور عورتوں کو مرنے والے کی وراثت سے شریعت کے مطابق حصہ ملے۔

اس شریعت بل پر ایک بڑا اشکال پیش ہو گیا تھا جس پر اس زمانے میں بڑی بحث ہوئی تھی کہ کیا ایک باطل نظام میں شریعت کا مطالبہ درست ہے؟ کیونکہ اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی، برطانوی استعمار کا تسلط تھا، اسمبلیاں بھی برطانوی نظام کے تحت وجود میں آئی تھیں، اوپر ملکہ برطانیہ تھی، جس کے تحت ہندوستان میں وائسرائے کی حکومت تھی۔ یہ ایک باطل نظام تھا تو کیا ایک کافر حکومت اور باطل نظام کے تحت شریعت کے کسی قانون کے نفاذ کا مطالبہ درست بھی ہے یا نہیں؟ اس پر بڑی لمبی بحث چلی تھی اور آپس میں بہت مباحثے ہوئے۔ اس وقت جمعیت علماء ہند کے صدر مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ تھے۔ ان کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ سرحد اسمبلی جو کہ ایک کافر نظام کے تحت، انگریزوں کی حکومت کے تحت قائم ہوئی ہے، کیا سرحد اسمبلی میں شریعت بل کے نام سے بل پیش کرنا اور اس سے مطالبہ کرنا کہ وہ شریعت کا قانون کسی شعبے میں نافذ کرے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

اس پر مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے بحیثیت مفتی اور بحیثیت صدر جمعیت علماء ہند یہ فیصلہ دیا تھا کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل کا پیش کرنا درست ہے اور مسلمانوں کو اس کی کامیابی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان کا یہ فیصلہ جمعیت علماء ہند کے اخبار ہفت روزہ الجمعیۃ میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے فتاویٰ کے مجموعہ ”کفایت المفتی“ میں چھپی ہوئی ہے۔ مفتی اعظم ہندؒ

نے اس کی اجازت دی کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کیا جاسکتا ہے، جو اس وقت پاس نہیں ہوا، لیکن بہرحال یہ پہلا شریعت بل تھا جو سرحد اسمبلی میں ۱۹۳۵ء کے الیکشن کے بعد پیش ہوا تھا، جس میں وراثت کی شرعی تقسیم کو قانونی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

پنجاب میں یہ مسئلہ بعد میں پیش آیا جب پاکستان بن گیا تو ایک طرف سے کمیونزم کی یلغار تھی تو زمینداروں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک انجمن بنائی۔ چونکہ انڈیا میں زمینداریاں اور نوابیاں ختم کردی گئی تھیں تو پنجاب اور سندھ میں زمینداروں نے ”انجمنِ تحفظِ حقوقِ زمینداراں“ کے نام سے اپنی ایک انجمن بنائی اور اپنی ملکیت اور حقوق کے تحفظ کے لیے بڑے بڑے زمیندار اکٹھے ہو گئے۔ اس انجمن میں نوابزادہ نصر اللہ خان بھی تھے جو پاکستان بننے سے پہلے آل انڈیا مجلسِ احرارِ اسلام کے سیکرٹری جنرل تھے اور قومی رہنماؤں میں سے تھے۔ مجھے بھی الحمدللہ ان کے ساتھ سالہا سال تک پاکستان قومی اتحاد کی تحریک اور دوسری تحریکات میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ ہمارے قومی لیڈروں میں سے اور بڑے اچھے رہنماؤں میں سے تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان بھی بڑے زمیندار تھے تو اس انجمن میں شامل ہوئے اور کوشش کر کے اس میں ایک لفظ شامل کروادیا ”انجمنِ تحفظِ حقوقِ زمینداراں تحت الشریعہ“۔ اس میں تحت الشریعہ کا لفظ بڑھایا اور کہا کہ ہم حقوق مانگتے ہیں لیکن شریعت کے تحت حقوق کا تحفظ بھی کریں گے۔ بعد میں یہ تحریک زیادہ نہیں چلی لیکن میں تاریخ کا ایک حصہ بتا رہا ہوں کہ یہ بھی ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد جب زمینداروں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی تو اس میں جو ہمارے نمائندے موجود تھے نوابزادہ نصر اللہ خان، انہوں نے کوشش کر کے یہ شق شامل کروائی کہ ہم شریعت کے تحت سارے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ یہ میں ماضی کی بات کر رہا ہوں کہ یہاں شریعہ کا لفظ پہلے بھی چلا آتا رہا ہے۔

پاکستان سے ملحق ریاستیں اور ان کا عدالتی نظام

پاکستان کے حصے میں جو ریاستیں آئیں یعنی قلات، خیرپور سندھ، بہاولپور، سوات، دیر، امبھ اور چترال، یہ اندرونی طور پر خود مختار تھیں۔ ان کا عدالتی نظام وہی تھا جو مغلیہ دور میں فقہ حنفی کی بنیاد پر چلا آ رہا تھا اور لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد ان ریاستوں کے ساتھ بات چیت چلی کہ ان کا پاکستان میں باقاعدہ ادغام ہونا چاہیے۔ یہ ادغام صدر ایوب خان کے دور میں ہوا کہ ریاستوں کو ختم کر کے ان کو باقاعدہ پاکستان کا حصہ

بنایا گیا۔ اس وقت ان کا عدالتی نظام ختم کر کے جو پاکستان میں انگریزی اور برطانوی عدالتی نظام تھا وہ وہاں تک وسیع ہو گیا۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ پاکستان شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے بنا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد ان ریاستوں کے الحاق کے بعد جہاں جہاں کچھ تھوڑے بہت شرعی قوانین نافذ تھے وہ بھی منسوخ ہو گئے۔ اگر اس خطے کا اندازہ کریں تو آدھا پاکستان نہیں تو تیسرا حصہ ضرور بنتا ہے۔ وہاں کسی درجے میں شریعت کے قوانین نافذ تھے جو کہ پاکستان بننے کے بعد ختم ہو گئے، یہ ہماری تلخ داستان ہے۔ بجائے اس کے کہ باقی علاقوں میں بھی شریعت کے قوانین نافذ ہوتے، عملاً یہ ہوا کہ جن علاقوں میں کچھ شرعی قوانین تھے وہاں سے بھی ختم ہو گئے۔ حالانکہ ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے وقت قلات اور سوات کا تو باقاعدہ معاہدہ ہوا کہ ہمارا عدالتی نظام باقی رکھیں گے، اور بہاولپور کا بھی معاہدہ ہوا لیکن اس کی پابندی نہیں کی گئی۔ چنانچہ قلات کے لوگ اب جو ناراض ہیں اور وہاں کے سابق نواب ناراض ہو کر لندن میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے مطالبات اور شکایتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے جن شرطوں پر اور جس معاہدے کے تحت الحاق کیا تھا اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

سوات میں جو صورتحال ہے اور جو معرکے ہوئے ہیں اس کا پس منظر بھی یہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مولانا صوفی محمد نے ایک تحریک چلائی جس کا بنیادی مطالبہ یہی تھا کہ شرعی عدالتی نظام ختم ہونے اور انگریزی نظام آنے سے ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ پہلے ہمارے ہاں انصاف فری ہوتا تھا اب پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ پہلے شرعی قوانین تھے، فیصلے عدالت میں آسانی سے ہو جاتے تھے، اب اپیل در اپیل کے چکر میں پڑے رہتے ہیں اور کئی سال گزر جاتے ہیں۔ پہلے مسجد میں قاضی صاحب بیٹھتے تھے، آسانی سے دو چار پیشیوں میں فیصلہ ہو جاتا تھا، اب سالہا سال مقدمے چلتے رہتے ہیں اور فیصلوں پر اطمینان بھی نہیں ہوتا۔ ان کا ابتدائی مطالبہ بالکل سادہ سا تھا کہ ہمارا پہلا عدالتی نظام واپس لایا جائے کہ اس میں سہولت تھی، اس میں انصاف بھی تھا اور شریعت بھی تھی۔

اس پر سوات کی عوام سڑکوں پر آئے تو سوات کے عوام سے باقاعدہ معاہدہ کیا گیا کہ ٹھیک ہے مالاکنڈ ڈویژن میں پرانا عدالتی نظام اور پرانی عدالتیں بحال کی جائیں گی، اس کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ میں بھی ان دنوں سوات گیا، وہاں کا دورہ کیا، ساری صورتحال کا جائزہ لیا اور ہم نے وہ پوری رپورٹ چھاپی تھی۔ یہ معاہدہ تقریباً دو دفعہ ہوا ہے۔ ان کا مطالبہ وہی ہے لیکن اضافہ اتنا ہوا ہے کہ اب انہوں نے

ہتھیار اٹھالیے۔ ہم نے ان کے ہتھیار اٹھانے سے اتفاق نہیں کیا لیکن ان کا مطالبہ ٹھیک ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس وقت بلوچستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین لشکر رئیسانی تھے جو کہ اب بھی پیپلز پارٹی کے رہنما ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ قلات میں سابقہ شرعی عدالتی نظام بحال کیا جائے کیونکہ لوگوں کو اس میں سہولتیں ہیں، آسانی ہے اور انصاف ہے۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کے حوالے سے ایک تناظر تو یہ ہے۔

۱۹۸۷ء کا شریعت بل

ہمارا ماضی قریب کا جو شریعت بل تھا اس کا پس منظر یہ ہوا کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے جب غیر جماعتی بنیادوں پر مجلسِ شوریٰ قائم کی اور سینٹ کو بحال کر کے اس کے انتخابات کروائے، تو سرحد کی طرف سے جو سینیٹر منتخب ہوئے ان میں ہمارے دو محترم بزرگ مولانا قاضی عبداللطیف کلاچیؒ اور مولانا سمیع الحقؒ اکوڑہ خٹک سینیٹر منتخب ہوئے۔ یہ اس دور میں تقریباً چھ سال سینٹ کے ممبر رہے۔ ۱۹۸۷ء میں انہوں نے سینٹ آف پاکستان میں ''شریعت بل'' پیش کیا جس میں بنیادی شق یہ تھی کہ دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے کہ ملک میں قرآن و سنت سے متصادم کوئی قانون نہیں بنے گا، اگر کوئی ایسا قانون نافذ ہے تو اس دفعہ کے نفاذ کے بعد وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ ملک کا کوئی قانون، ضابطہ یا روایت اگر شریعت کے منافی ہے تو وہ اس قانون کے نفاذ کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی۔ گویا یوں سمجھ لیجیے کہ قرآن و سنت کی دستوری بالادستی کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرانے کا بل تھا۔

سینٹ آف پاکستان میں یہ بل پیش ہوا۔ پورے ملک میں بحث مباحثہ ہوا۔ ملک بھر میں شریعت بل مہم چلی اور تمام مکاتبِ فکر کا ایک مشترکہ فورم ''متحدہ شریعت محاذ'' کے نام سے تشکیل پایا۔ مولانا عبدالحق صاحبؒ اکوڑہ والے اس کے صدر تھے، قاضی حسین احمد مرحوم جماعت اسلامی کے سابقہ امیر اس کے سیکرٹری جنرل، بریلوی مکتبِ فکر کے بڑے عالم مفتی محمد حسین نعیمی نائب صدر، اہلِ حدیث رہنما مولانا عبدالغفار روپڑی نائب صدر اور میں سیکرٹری اطلاعات تھا۔ تقریباً تمام مکاتبِ فکر کی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ ہم سب نے مل جل کر ''متحدہ شریعت محاذ'' بنایا۔ اس میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ بہت متحرک تھے، اور سوادِ اعظم اہلِ سنت کراچی کے مولانا اسفندیار خان، مفتی احمد الرحمنؒ اور حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ، یہ سب حضرات سوادِ اعظم کے قائد تھے اور شریعت بل کی تحریک میں مکمل طور پر ہمارے ساتھ تھے۔

جب شریعت بل کی تحریک چلی تو جماعتی معاصرت کے باعث مولانا فضل الرحمٰن نے ابتدا میں مخالفت کی لیکن بالآخر وہ بھی ہماری تحریک میں ہمارے ساتھ آئے۔ راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں بڑا کنونشن ہوا جس کی ایک نشست کی صدارت مولانا فضل الرحمٰن اور دوسری نشست کی صدارت مولانا محمد خان شیرانی نے کی۔ سب اکٹھے ہوگئے اور دوسری جماعتیں بھی تھیں۔ اس زمانے میں شریعت بل کی منظوری کے لیے پورے ملک میں تحریک چلی۔ جلوس، جلسے، مظاہرے ہوئے۔ ہم نے پارلیمنٹ کے سامنے بہت بڑا مظاہرہ کیا تھا، میں بھی اس میں شریک ہونے والوں اور کام کرنے والوں میں شامل تھا۔ یہ پورے ملک میں ایک متفقہ شریعت بل تھا۔

تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا معاملہ

اس میں ایک فرق پڑا۔ یہ وہ دور تھا جب ایران کا انقلاب آچکا تھا اور پاکستان میں نفاذِ فقہ جعفریہ کی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ علامہ عارف الحسینی پاکستان میں جناب آیت اللہ خمینی کے نمائندے کے طور پر متعارف تھے۔ وہ لکھتے بھی تھے کہ میں خمینی کا نمائندہ ہوں۔ اور ہمارے گوجرانوالہ کے مفتی جعفر حسین شیعہ کے بڑے علماء میں سے تھے، ان کی قیادت میں اور علامہ عارف الحسینی اور آغا حامد موسوی سے اس تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں وہ تبدیلی بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے جب ہم شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کرتے تھے اس میں، اور شریعت بل کی تحریک میں دو بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ وہ یہ کہ شیعہ ایران انقلاب کے بعد مفتی جعفر حسین کی قیادت میں تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے نام سے منظم ہو گئے تھے۔ فقہ جعفریہ کے نفاذ کے مطالبے پر تحریک کا آغاز کیا تھا اور اسلام آباد وفاقی سیکرٹریٹ پر دھرنا دیا تھا اور اسلام آباد کے سول سیکریٹریٹ کا کافی دن گھیراؤ رکھا تھا۔ اس پر صدر ضیاء الحق نے ان کے کچھ مطالبات زکوٰۃ وغیرہ کے مانے بھی تھے۔

اس کے بعد پھر رخ تبدیل ہو گیا۔ سپاہِ صحابہ بعد میں وجود میں آئی ہے۔ اُس وقت سوادِ اعظم اہلِ سنت کراچی کا اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کا آمنا سامنا تھا۔ شیعہ کمیونٹی کی قیادت یہ تحریک کر رہی تھی اور دیوبندی مکتبِ فکر میں اہل سنت پر کام کرنے والوں کی قیادت سوادِ اعظم اہلِ سنت پاکستان کر رہی تھی۔ اس وقت ایک متحدہ سنی محاذ بھی بنا تھا، تمام دیوبندی جماعتیں اس کی محرک تھیں۔ لاہور شیرانوالہ میں ''سوادِ اعظم کنونشن'' ہوا تھا اور دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی تمام جماعتیں متحدہ سنی محاذ کے نام سے متحد ہوگئی تھیں۔ مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ اس کے صدر تھے اور میں رابطہ سیکرٹری تھا، دیگر عہدیدار

منتخب نہیں ہوئے تھے، ہم نے ایک نئے سرے سے آغاز کیا۔

یہ میں اس دور کا تناظر بیان کر رہا ہوں جب متحدہ شریعت محاذ تشکیل پایا۔ راولپنڈی میں جامعہ اسلامیہ میں میٹنگ تھی۔ مولانا عبدالحقؒ کی قیادت اور صدارت میں اجلاس ہو رہا تھا اور تمام مکاتبِ فکر دیوبندی، بریلوی، جماعت اسلامی اور اہل حدیث سب موجود تھے۔ وہاں یہ مسئلہ پیش آیا کہ آیا شیعہ کو تحریک میں شامل کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے؟ شیعہ تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے۔ علامہ عارف الحسینی وفد لے کر اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ مجھے اشارہ کریں تو میں آتا ہوں، لیکن سوادِ اعظم اہلِ سنت والجماعت کا موقف یہ تھا کہ شیعہ کو تحریک میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس فیصلے کا احترام کیا گیا اور ان کو دعوت نہیں دی گئی۔ جس سے انہوں نے شریعت بل کی مخالفت کا اعلان کر دیا، اور اس کے بعد ملک میں بڑی معرکہ آرائی ہوئی۔

چونکہ میں اس تحریک کا کارکن ہوں، میں اپنے دل کی بات ضرور کروں گا کہ اس سے ہمیں یہ نقصان ہوا کہ وہ جو ہم نے علماء کے بائیس نکات کی صورت میں دنیا کو پیغام دیا تھا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کے مسئلہ پر کوئی فرقہ وارانہ اختلاف نہیں ہے، ہمارا وہ موقف ختم ہو گیا اور اب پاکستان میں شریعتِ اسلامیہ متضاد موقف بن گئی کہ شیعہ الگ موقف پیش کر رہے ہیں اور سنی الگ موقف پیش کر رہے ہیں۔ ہمارا کیمپ الگ ہو گیا اور شیعہ کا کیمپ الگ ہو گیا۔ وہ فقہ جعفریہ کے نفاذ کی بات کرنے لگے، اور ان کے ردعمل میں ہمارے دوستوں نے جب نفاذِ فقہ حنفی کا نعرہ لگایا تو اہلِ حدیث حضرات بھی ہمارے مخالف ہو گئے۔ یہ حکمتِ عملی کی بات ہوتی ہے، ہم نے پاکستان میں کبھی فقہ حنفی کے نفاذ کا نعرہ نہیں لگایا، اس لیے کہ جب بھی نافذ ہونی ہے تو فقہ حنفی ہی ہونی ہے کیونکہ پاکستان میں اکثریت اس کی ہے۔ لیکن جب نفاذِ فقہ جعفریہ کی بات ہوئی اور جواب میں فقہ حنفی کی بات ہوئی تو اس کے جواب میں اہل حدیث کا بہت بڑا گروپ ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم نے پورے ملک میں شریعت بل کے خلاف مہم چلا دی کہ یہ حنفیوں کی فقہ ہے۔ وہ میرے ذاتی بے تکلف دوست تھے لیکن میں ان کو قائل نہیں کر سکا۔ مولانا معین الدین لکھنوی ہمارے ساتھ تھے، جبکہ علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنے پورے گروپ سمیت شریعت بل کے مخالف تھے۔ اخبارات میں بیانات آتے، مضامین لکھتے اور تقاریر میں مخالفت کرتے رہے۔

اس کا پس منظر میں نے یہ عرض کیا ہے کہ شیعہ کو متحدہ محاذ میں شریک نہ کرنا، اس پر نفاذِ فقہ جعفریہ

کا مطالبہ، پھر نفاذِ فقہ حنفی کا مطالبہ اور پھر اہل حدیث حضرات کا یہ ردعمل۔ یہ اچھا خاصا کھڑاگ پک گیا، لیکن جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس فضا میں کچھ اور مسائل کھڑے ہو گئے۔ شریعت بل کی تحریک میں ہمیں دو تین نئے محاذوں کا سامنا تھا جن کا ہمیں پہلے کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پارلیمنٹ کی رکنیت کی اہلیت کا مسئلہ

شریعت بل کے حوالے سے دو بحثیں ہوئیں۔ مذاکرات میں قاضی عبداللطیف، مولانا سمیع الحق، ڈاکٹر اسرار احمد، قاضی حسین احمد تھے، میں بھی تھا۔ ادھر سے ہمارے دوست وفاقی وزیر مذہبی امور اقبال احمد خان مرحوم اور وزیر قانون وسیم سجاد تھے جو بعد میں سینٹ کے چیئرمین بھی رہے ہیں ملک کے معروف قانون دان ہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے ہم قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں، آئین میں طے کر دیتے ہیں، لیکن ایک شرط پر کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح میں آپ پارلیمنٹ کو اتھارٹی تسلیم کریں کہ اس کی اکثریت جو تعبیر طے کر دے وہی تسلیم ہو گی۔ یہ بات آپ مان لیں، وہ بات ہم مان لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات ماننے کی نہیں تھی کیونکہ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ جاننا بھی شرط نہیں ہے۔ وہ آدمی جو سورہ فاتحہ کا ترجمہ نہیں جانتا اس سے سورہ طلاق کے احکام و مسائل پوچھے جائیں تو وہ کیا کرے گا۔ جس پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص بھی پڑھنا شرط نہ ہو، اس پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر اور تشریح کا اختیار دیں گے تو اس کا کیا نتیجہ سامنے آئے گا۔ اس پر میں نے وزیر مذہبی امور کو لطیفہ سنایا جو مولانا روم نے مثنوی میں ذکر کیا ہے۔

مولانا روم نے مثنوی میں بڑی عجیب کہاوتیں اور مثالیں بیان کی ہیں۔ انہوں نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک زمانے میں جب چھاپہ خانے نہیں ہوتے تھے تو قرآن پاک ہاتھ سے لکھے جاتے تھے۔ لوگ پڑھنے کے لیے کاتب سے نسخہ لکھوا لیتے تھے۔ ایک آدمی نے کسی کاتب سے کہا کہ مجھے قرآن پاک کا ایک نسخہ لکھ دو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے لکھ دوں گا۔ ہدیہ طے ہوا کہ اتنا ہدیہ ملے گا۔ اس نے مدت بھی طے کر دی کہ دو تین مہینے میں لکھ دوں گا۔ لہٰذا اس نے دوسرے نسخے سے دیکھ کر لکھ کر مکمل کر لیا۔ جب وہ آدمی کاتب کے پاس نیا نسخہ لینے کے لیے گیا تو اس سے پوچھا کہ دھیان سے لکھا ہے، اس میں کوئی غلطی تو نہیں ہے؟ کاتب نے کہا کہ میں نے بڑی توجہ سے لکھا ہے اور بڑی محنت اور کوشش کی ہے کہ کوئی غلطی نہ ہو، لیکن جس قرآن پاک کو دیکھ کر میں نے یہ نسخہ لکھا ہے اس میں دو تین غلطیاں تھیں وہ میں نے

صحیح کردی ہیں۔ اس آدمی نے پوچھا وہ کون سی غلطیاں تھیں تو کاتب نے کہا کہ اس قرآن میں لکھا ہوا تھا وعصیٰ آدم ربہ فغوی۔ میں نے سوچا کہ عصا حضرت آدمؑ کا تو نہیں تھا حضرت موسیٰؑ کا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ٹھیک کرکے لکھ دیا وعصی موسیٰ ربہ فغوی ۔اس نسخے میں دوسری غلطی یہ تھی کہ اس میں لکھا ہوا تھا ولقد نادانا نوح میں نے سوچا کہ نوح علیہ السلام تو پیغمبر تھے اور پیغمبر نادان تو نہیں ہوتا وہ تو عقلمند اور دانا ہوتا ہے، تو میں نے اس کو لکھ دیا ولقد دانا نوح۔ اس قرآن میں تیسری جگہ لکھا ہوا تھا خر موسیٰ صعقا میں نے سوچا کہ خر حضرت موسیٰؑ کا تو نہیں تھا حضرت عیسیٰؑ کا تھا۔ خرِ عیسیٰ مشہور ہے تو وہ غلطی بھی میں نے ٹھیک کردی اور خر عیسیٰ صعقا لکھ دیا۔ اس کے بعد کاتب نے کہا کہ جو نسخہ تم دے کر گئے تھے اس میں ایک غلطی بہت زیادہ مرتبہ دہرائی گئی تھی۔ اس میں جگہ جگہ شیطان اور فرعون کا نام آیا ہوا تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ قرآن پاک تو اللہ کا کلام ہے، اس کے ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں، نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے تو کیا نماز میں بھی شیطان اور فرعون کا نام لیں گے۔ فرعون کا نام قرآن مجید کے لفظ کے طور پر پڑھیں گے تو پچاس نیکیاں ملیں گی؟ میں نے سوچا کہ قرآن مجید کے ہر حرف پر تو دس نیکیاں ملتی ہیں اس میں فرعون اور شیطان کا کیا کام، تو یہ دو لفظ میں نے ہر جگہ بدل دیے اور ایک کی جگہ اپنے باپ کا نام لکھ دیا اور ایک ہی جگہ تمہارے باپ کا نام لکھ دیا۔

میں نے مذاکرات میں اقبال احمد خان سے کہا کہ ٹھیک ہے یہ بات طے کرلیتے ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں، لیکن پھر یہ بتادیں کہ نام کس کس کے آئیں گے؟ اس پر وہ سٹپٹائے۔

پارلیمنٹ کیلئے حقِ اجتہاد کا مطالبہ

شریعت بل کے حوالے سے جو بحثیں پیدا ہوئیں ان میں ہمارے جدید دانشوروں کی طرف سے ایک بحث اب تک چل رہی ہے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہوگا اور ہر چیز اس کے مقابلے میں ختم ہوجائے گی، تو یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہوگا کہ کون سی چیز قرآن و سنت کے مطابق ہے اور کون سی چیز ان کے مطابق نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ جب کہ ہمارا موقف یہ تھا کہ اگر فیصلے کی آخری اتھارٹی پارلیمنٹ ہو تو وہ اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرے گی، جدھر ووٹ زیادہ ہوں گے، وہ شریعت ہوگی اور جدھر ووٹ کم ہوں گے وہ شریعت نہیں ہوگی۔ اس سے بڑا کنفیوژن پیدا ہوگیا۔ یہ باریک نکتہ سمجھیں۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ قرآن و سنت کا حکم ماننا ہے۔ وہ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ قرآن و سنت کے مطابق قرار دینا یا نہ قرار دینا، اس میں اتھارٹی کون ہے؟ اس میں

پارلیمنٹ سے ہٹ کر کوئی اتھارٹی ہوگی تو پارلیمنٹ کی خود مختاری کہاں گئی؟

اسی بحث میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ پارلیمنٹ کا حقِ اجتہاد تسلیم کیا جائے۔ یہ علامہ اقبال مرحوم کی پرانی تجویز تھی ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال نے لا کر سامنے کر دی کہ پارلیمنٹ کا حقِ اجتہاد تسلیم کیا جائے۔ پارلیمنٹ اپنے اصول طے کرے اور اجتہاد بھی کرے۔ ہمارے لیے یہ موقف قابلِ قبول نہیں تھا۔ اگرچہ علامہ اقبال نے درمیان کی راہ اختیار کی تھی، جو بات یہ کہتے ہیں وہ نہیں کہی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں لکھا ہے۔ علامہ اقبال کے خطبات جدید دور میں اسلامائزیشن کے لیے بڑی فکری اہمیت رکھتے ہیں، لیکن دونوں طرف اس کا غلط استعمال ہوا ہے۔ مخالفت میں بھی حد سے زیادہ بڑھ گئے اور حمایت میں بھی حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ جو علامہ اقبال کا موقف تھا، بطور تجویز کے کوئی حرج نہیں تھی کہ اس میں غور کیا جائے کہ پارلیمنٹ کو ہی حق دے دیا جائے۔ لیکن پارلیمنٹ کے ساتھ جید علماء کی ایک کونسل ہو جس سے رہنمائی کی وہ پابند ہو۔ جیسے اب اسلامی نظریاتی کونسل وغیرہ ہیں۔ یہ اصل میں اقبال کی تجویز ہی تھی لیکن یہ جب بحث چلی تو ہمارے جدید دانشوروں کا ذہن تھا اور ہے کہ پارلیمنٹ کو ہی اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔

یہ بحث کہ پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر اور تشریح میں اتھارٹی مان لیں تو ہم قرآن و سنت کو بطور قانون مان لیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت ہمارے حوالے کر دو، ہم اس کے ساتھ جو معاملہ کرنا چاہیں کریں۔ یہ بہت بنیادی جھگڑا ہے۔ میں اس حوالے سے ایک اور مذاکرہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ انہی دنوں ملک کے اخبارات میں بحث چل رہی تھی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق ہے یا نہیں ہے؟ غالباً ۱۹۹۱ء کی بات ہے۔ لاہور میں روزنامہ نوائے وقت کا فورم تھا ایوانِ وقت، جس میں جسٹس صاحبان بھی تھے، صحافی حضرات بھی تھے، میں بھی تھا۔ اس زمانے میں میرا شمار اس تحریک کے سرکردہ لوگوں میں ہوتا تھا، مجھے تحریک کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال اور جسٹس نسیم حسن شاہ، اس درجے کے لوگ اس فورم میں تھے۔ وہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینا چاہیے یا نہیں دینا چاہیے؟ ہمارا معروف موقف تو یہ ہے کہ نہیں! پارلیمنٹ کو کیسے ہم اجتہاد مطلق کا حق دے سکتے ہیں؟ لیکن میں نے وہاں یہ بات نہیں کہی۔ مجھ سے جب سوال ہوا کہ مولانا! آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق بالکل ہونا چاہیے۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے کہ مولوی کیا کہہ رہا ہے۔ کیونکہ میں متحدہ شریعت محاذ کا نمائندہ تھا اور میں کہہ رہا تھا کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے

دینا چاہیے۔

میں نے کہا کہ میں پارلیمنٹ کا حقِ اجتہاد تسلیم کرتا ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ اجتہاد کی اہلیت کی شرائط طے کی جائیں کہ کون آدمی اجتہاد کے مرتبے کو پہنچتا ہے؟ میں نے کہا یہ بھی میں طے نہیں کرتا کہ مجتہد کے لیے کیا شرائط ہیں۔ سپریم کورٹ میں باقاعدہ ریفرنس دائر کیا جائے کہ اس دور میں ایک عالم کے مجتہد ہونے کے لیے کیا شرائط ہونی چاہئیں؟ یہ شرائط ہر زمانے میں مختلف ہوتی ہیں۔ سپریم کورٹ یہ طے کرے کہ آج کے دور میں اجتہاد کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے کیا شرائط اور کیا ریکوائر منٹس ہیں۔ سپریم کورٹ سے طے کروانے کے بعد آپ ایسا کریں کہ الیکشن قوانین میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کا رکن بننے کے لیے ان شرائط کو ضروری قرار دیں کہ قومی اسمبلی کا اور سینیٹ کا ممبر وہ ہو سکتا ہے جو اجتہاد کی یہ شرطیں پوری کرتا ہو، اور یوں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دیں۔ اگر ایسا کر لیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا مجھے کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس پر سناٹا چھا گیا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ لطیفے کی بات میں نے اس لیے کی ہے کہ یہ بات کہنے کا اسلوب ہوتا ہے، کبھی بات کے لیے ڈنڈا نہیں مارا جاتا، بسا اوقات بغل میں جا کر بات کرنی پڑتی ہے۔

حقِ اجتہاد اور طرفین کے موقف

اس میں ذرا ان کا موقف بھی سن لیں۔ جدید دانشوروں کا موقف یہ ہے کہ علماء اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ علماء آج کے زمانے اور حالات، آج کے نظام اور ماحول، آج کی معاشرت اور سماجی ضروریات سے واقف نہیں ہیں۔ ان سے سوال ہوا کہ دین کا علم تو ان کے پاس ہے، تو انہوں نے کہا کہ اسلامی علوم کا متبادل تراجم کی صورت میں موجود ہیں۔ تفاسیر، حدیث، فقہ کے ترجمے موجود ہیں جن سے علمی خلا پر ہو سکتا ہے۔ لیکن حالاتِ زمانہ اور سسٹم سے ناواقفیت کا خلا پر نہیں ہو سکتا، اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

- ہم کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے رکن اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ وہ زمانے سے تو ضرور واقف ہیں لیکن جس چیز کو نافذ کرنا ہے اس سے واقف نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس قرآن پاک، سنتِ رسول اور فقہ اسلامی کا علم نہیں ہے۔
- اور وہ کہتے ہیں کہ جہاں اس کو نافذ کرنا ہے اس جگہ کا علم علماء کو نہیں ہے۔

دونوں کی باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، ہمیں بھی موجودہ زمانے کے سسٹم حالات سے اتنی واقفیت

نہیں ہے جو اجتہاد کی اہلیت کے لیے ضروری ہے، جبکہ امام شامیؒ کے بقول ہمارا فقہی اصول ہے من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل۔ جب ہم شریعت کے نفاذ کی بات کرتے ہیں تو جدید ذہن کے سامنے اشکالات اور اعتراضات ہوتے ہیں۔

ایک یہ اعتراض کہ شریعت کا نفاذ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ اس اشکال کا وہی حل تھا جو ہم نے بائیس نکات کی صورت میں پیش کیا، اس کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ شیعوں کا اسلام یا وہابیوں کا اسلام یا حنفیوں کا، کونسا اسلام نافذ کریں؟ جب ہم آپس میں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے کہ فقہ حنفی، فقہ جعفری اور فقہ قرآن و سنت، تو پھر ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اس کا حل وہی تھا جو ہمارے بزرگوں نے حکمتِ عملی سے دیا تھا بائیس نکات کی صورت میں۔

دوسرا بڑا مسئلہ پارلیمنٹ کی خود مختاری کا ہے۔ اس میں ہم نے درمیان کا راستہ اختیار کیا کہ کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ تو اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کرے گی لیکن اس کو نافذ اسمبلی کرے گی۔ دونوں کو ہم نے توازن کے ساتھ جمع کیا اور درمیان کا راستہ نکالا گیا۔ ابھی تک ان حضرات کو یہ بات ہضم نہیں ہورہی کہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کیوں قائم ہیں؟ ان کا کہنا ہے کہ ان کو ختم کرو، ان کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے پیچھے یہی ذہنیت کارفرما ہے کہ پارلیمنٹ خود مختار ہے، اس کے ساتھ یہ ادارے جوڑ کر پارلیمنٹ کی ساورنٹی اور خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔

شریعت بل کی منظوری کے مراحل

شریعت بل میں اس موقع پر ہمیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور کیا کیا مباحث پیش آئے اور اس شریعت بل کا کیا حشر ہوا؟ میں چونکہ اس موقع پر ذمہ دار لوگوں میں تھا تو ہمیں جو مسائل پیش آئے وہ ذکر کرتا ہوں۔

سینٹ میں مولانا سمیع الحقؒ اور مولانا قاضی عبداللطیفؒ نے شریعت بل پیش کیا تھا۔ ترتیب یہ ہوتی ہے کہ کوئی بل قومی اسمبلی میں پاس ہو تو وہ سینٹ میں پیش ہوتا ہے اور سینٹ کی منظوری کے بعد قانون بنتا ہے۔ اور اگر بل سینٹ میں پہلے پاس ہوجائے تو وہ قومی اسمبلی میں آتا ہے اور قومی اسمبلی کی منظوری سے بل بنتا ہے۔ اس کو نہ اکیلے اسمبلی نافذ کرسکتی ہے اور نہ سینٹ۔ اگر سینٹ میں بل آیا منظور ہوگیا تو وہ نوے دن کے اندر اندر اسمبلی میں آئے گا، اگر نوے دن کے اندر اندر اسمبلی میں پیش نہیں ہوا تو وہ ختم

ہو جائے گا۔ اسی طرح قومی اسمبلی نے بل پاس کیا تو وہ نوے دن کے اندر سینٹ میں جانا ضروری ہے سینٹ میں نہیں گیا تو ختم ہو جائے گا۔ شریعت بل کئی مراحل سے گزرا۔

ملک کے عمومی دباؤ اور تمام جماعتوں کی مشترکہ محنت سے سینٹ آف پاکستان نے وہ بل جس طرح ہم چاہتے تھے ویسا ہی منظور کر لیا۔ اس پر ہم نے پورے ملک میں جشن منایا۔ ہم نے راولپنڈی کے بڑے ہوٹل میں صدر محترم غلام اسحاق خان کو بہت بڑا استقبالیہ دیا، اس میں میاں نواز شریف اور مولانا فضل الرحمٰن بھی شریک ہوئے اور تمام ملک کی قیادت آئی، ہم نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ کبھی ہمارا بھی کوئی مطالبہ پورا ہوا ہے کہ سینٹ آف پاکستان نے شریعت بل کو ہماری مرضی کے مطابق پورے کا پورا منظور کر لیا۔ لیکن سینٹ میں منظور ہونے کے بعد اس بل نے نوے دن کے اندر اندر قومی اسمبلی میں پیش ہونا تھا لیکن نوے دن سے پہلے قومی اسمبلی تحلیل ہو گئی، حکومت ختم ہو گئی، نئے الیکشن کا اعلان ہو گیا اور شریعت بل بھی زیرو پوائنٹ پر جا کر کھڑا ہو گیا کیونکہ نوے دن میں پیش نہ ہو تو ویسے ہی قانون ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد الیکشن ہوئے جس میں محترم میاں نواز شریف وزیر اعظم بنے تو ہمیں خوشی ہوئی کہ اس میں ہمیں ذرا آسانی ہو گی کیونکہ پہلے جونیجو کا دور تھا پھر بے نظیر کا دور تھا۔ لیکن اب شریعت بل آیا تو پراسس الٹا ہو گیا کہ پہلے قومی اسمبلی پاس کرے گی پھر سینٹ پاس کرے گی۔ جب بل قومی اسمبلی میں آیا تو وہاں بھی وہی مذاکرات، وہی پرانی شرطیں، وہی جھگڑے اور وہی تنازع اور بین الاقوامی حلقوں کا دباؤ کہ شریعت انسانی حقوق کے منافی ہے ساری باتیں چلتی رہیں۔ حکومت کی طرف سے بل آیا اس پر بحث ہوتی رہی اور ہمیں لگتا تھا کہ پاس ہو جائے گا ہمیں امید تھی۔

آخری مرحلے پر دو دن پہلے اخباری اطلاعات کے مطابق اسلام آباد کی امریکی سفارتخانے میں میٹنگ ہوئی اور امریکی سفارتخانے نے کہا کہ یہ بل ہمیں منظور نہیں ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے۔ اور دو دن بعد اسمبلی میں جب شریعت بل منظور ہوا تو جو بنیادی دفعہ تھی اس کے الفاظ یہ تھے قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہوں گے بشرطیکہ سیاسی ڈھانچہ اور حکومتی نظام متاثر نہ ہو۔ قومی اسمبلی وہ بل پاس کر دیا لیکن اس شرط کے ساتھ جس سے وہ بل بالکل کالعدم ہو کر رہ گیا اور مسئلہ پہلے کھاتے میں واپس چلا گیا۔ یہ میں نے ان کی تکنیک ذکر کی ہے۔

قومی اسمبلی نے شریعت بل منظور کرتے ہوئے کہا کہ قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہوں گے بشرطیکہ

سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہ ہو۔ تو ہم نے ان سے پوچھا کہ سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچے میں شریعت نہیں آئے گی تو شریعت باقی کہاں آئے گی؟ مسجد میں تو شریعت ہے جتنی بھی ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں۔ ہم ملک کا سیاسی نظام ہی تو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور حکومتی ڈھانچہ ہی تو بدلنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ مستثنیٰ ہو جائیں تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔

اس پر بھی ملک میں دوسرے حلقے کے لوگوں نے جشن بنایا لیکن اس وقت سب سے زیادہ تکلیف ہمیں ہوئی کہ جو کام کرنے والے تھے۔ اس پر میں نے ایک استفسار مرتب کیا اور ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کو بھیجا۔ ان کے جواب آئے جسے ہم نے ماہنامہ الشریعہ میں شائع کیا، ریکارڈ میں وہ موجود ہے۔ علماء کرام نے اس استثنا کو مسترد کر دیا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے، یہ شریعت کی بالادستی نہیں ہے بلکہ شریعت کو محدود کرنے کی کوشش ہے۔ اس پر ہم نے ملک میں کمپین کی، تقریباً تین چار سال ملک میں گہما گہمی رہی اور پھر کمپین اپنے اختتام کو پہنچی اور قرآن و سنت اب بھی ملک کا سپریم لاء ہے لیکن اسی معنی میں جس میں قومی اسمبلی نے منظور کیا تھا۔

میں نے تین طبقات کا ذکر کیا:

1. ایک طبقہ تو کہتا ہے کہ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
2. اور یہ دوسرا طبقہ ہے جو ریاست سے مذہب کا تعلق تسلیم کرتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ اور ہماری رولنگ کلاس کا عملی طرز یہ ہے کہ وہ اسلام کی نفی بھی نہیں کریں گے، انکار بھی نہیں کریں گے، کلمہ بھی پڑھیں گے، پاکستان کو اسلامی ریاست بھی کہیں گے اور دستور کا اسلامی تشخص بھی تسلیم کریں گے، لیکن جب عملدرآمد کی بات ہوگی تو وہ اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے کسی قانون کو نافذ نہیں ہونے دیں گے، یا اگر کوئی قانون نافذ ہو جائے گا تو اس پر عملدرآمد نہیں ہوگا۔ شریعت کے نفاذ کے حوالے سے یہ ہماری داخلی لڑائی ہے۔
3. جبکہ تیسرا طبقہ ہمارا ہے جو ملک میں مکمل نفاذ اسلام چاہتے ہیں۔ لیکن ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم خود تقسیم ہیں۔ ہمارا موقف تو ایک ہے لیکن اس کے باوجود بکھرے ہوئے ہیں اور متحد ہو کر کوئی بات منوانے کی طرف نہیں آرہے، جو مسائل کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ ہماری کمزوری ہے کیونکہ دینی مکاتب فکر نے جب بھی پاکستان میں کسی مسئلے پر متفق ہو کر بات کی ہے تو ہمیں ناکامی نہیں ہوئی۔ ہم اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک بات منوا کر پھر گھروں میں چلے جاتے ہیں اور

آپس میں لڑنا شروع کردیتے ہیں۔ جب تک ہماری یہ کمزوری رفع نہیں ہوگی کہ ہم مستقل محاذ بنا کر ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے ان دونوں طبقوں، جن میں سے پہلا طبقہ تو اتنا مؤثر نہیں ہے، دوسرا طبقہ اصل رولنگ کلاس ہے، اس کو دباؤ میں لاکر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ ہم متحد ہوں۔ جس طرح ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت میں ہم متحد ہوتے ہیں اگر نفاذِ شریعت میں بھی متحد ہوجائیں تو میرے خیال میں بہت ساری باتیں ختم کروائی جاسکتی ہیں۔

سودی نظام کے خلاف جدوجہد

ابتدا میں جب وفاقی شرعی عدالت بنی تو اس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ملک کے کسی بھی قانون کو خود یا کسی کے توجہ دلانے پر جائزہ لے کر قرآن و سنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ اور اگر وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق نہیں تو اس کی نشاندہی کرے اور حکومت کو آرڈر کرے کہ یہ قانون ختم کر دیا جائے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ اگر ایک مدت تک حکومت قانون ختم نہیں کرے گی تو وہ قانون خود بخود ختم ہوجائے گا۔

ابتدا میں دس سال کے لیے مالیاتی قوانین کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا کہ مالیاتی قوانین اور معیشت سے متعلقہ قوانین وفاقی شرعی عدالت میں زیرِ بحث نہیں آسکتے تھے۔ دس سال گزرنے کے بعد کچھ دینی رہنماؤں نے، جس کا میں بھی کسی درجے میں حصہ ہوں، رٹ دائر کی کہ ملک میں جتنے بھی سودی قوانین ہیں وہ قرآن و سنت سے متصادم ہیں۔ اس لیے جن قوانین کا تعلق سود کے لین دین سے ہے ان کو ختم کیا جائے اور ان کے متبادل قوانین نافذ کیے جائیں، جو باقاعدہ تجویز کیے گئے۔ اس پر اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت دونوں نے کام کیا کہ سودی نظام سے متعلقہ قوانین کون کون سے ہیں، اور سودی نظام ختم کرنے سے جو خلا پیدا ہوگا اس کو کس طرح پر کریں گے۔

اس پر اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک بڑی جامع رپورٹ ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے مرتب کی، جو کونسل کے چیئرمین تھے۔ وہ رپورٹ ریکارڈ پر موجود ہے، اس میں اشکالات کا حل اور ان کے جوابات بھی ہیں۔ کئی سال کی سماعت کے بعد وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ ملک میں فلاں فلاں قانون سودی ہیں قرآن و سنت سے متصادم ہیں اس لیے حکومت انہیں ختم کرے اور اگر حکومت فلاں تاریخ تک ختم نہیں کرے گی تو یہ قوانین خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ یہ وفاقی شرعی عدالت کو اختیار ہے کہ وہ مدت متعیّن کرے کہ فلاں تاریخ تک یہ قانون ختم نہیں کروگے تو خود بخود ختم ہوجائے گا، بہت سے

قوانین ختم ہوئے بھی ہیں، لیکن وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کو سپریم کورٹ کے اپیل بینچ میں چیلنج کر دیا گیا۔ ٹھیک ہے یہ قانونی طور پر حق تھا۔

سپریم کورٹ میں جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور دوسرے فضلاء موجود تھے، انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ درست اور نافذ العمل ہے۔ سودی قوانین قرآن و سنت سے متصادم ہیں ان کو ختم ہونا چاہیے۔ یہ سپریم کورٹ کے فل بینچ کا فیصلہ تھا جس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ البتہ ایک کھڑکی موجود ہے کہ اسی بینچ سے نظر ثانی کی اپیل کر دی جائے کہ اس میں یہ یہ اشکالات ہیں، اس لیے دوبارہ غور کر لیا جائے۔ اس وقت میاں محمد نواز شریف کی حکومت تھی۔ حکومت نے خود اس فیصلے کو چیلنج نہیں کیا لیکن کچھ حضرات نے سپریم کورٹ میں نظر ثانی کی اپیل دائر کر دی کہ اس فیصلے پر ہمارے اشکالات اور تحفظات ہیں لہٰذا اس پر نظر ثانی کی جائے۔ اور نظر ثانی کے لیے یہ اہتمام کر لیا گیا کہ جس بینچ نے فیصلہ دیا تھا وہ بینچ جب ختم ہو گیا اور نیا بینچ بنایا گیا تو اس کے سامنے یہ اپیل دائر کی گئی۔ اور اس پورے پراسس پر اٹھارہ سال لگے۔

وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شرعی بینچوں کی مجموعی بات یہ ہے کہ یہ مستقل جج نہیں ہوتے بلکہ کنٹریکٹ پر آتے ہیں، دو تین سال کے لیے ان سے معاہدہ ہوتا ہے، اس کے مطابق نظام چلتا ہے۔ اس معاملے میں انتظار کیا گیا کہ جن ججوں نے فیصلہ دیا تھا ان کی مدت ختم ہو جائے اور نئے جج آجائیں تو اپیل دائر کی جائے۔ جب مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور ان دیگر ججوں کی مدت ختم ہو گئی جنہوں نے فیصلہ کیا تھا تو اس کے بعد ان سے کنٹریکٹ نہیں کیا گیا، بلکہ نئے ججز سے کنٹریکٹ کیا گیا اور نظر ثانی کی اپیل ان کے سامنے رکھ دی گئی۔ انہوں نے نظر ثانی کا عجیب فیصلہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ سماعت میں کوئی سقم رہ گیا ہے، اس لیے وفاقی شرعی عدالت دوبارہ سماعت کرے۔ یعنی اٹھارہ سال پہلے کی پوزیشن پر جہاں سے معاملہ شروع ہوا تھا وہاں سے دوبارہ شروع کریں۔

میں نے اس پر ایک کالم لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ ہمیں لڈو کا سانپ ڈس گیا ہے۔ لڈو میں کبھی سیڑھی مل جاتی ہے تو ایک سے ۷۰ پر چلے جاتے ہیں، اور کبھی سانپ ڈس جاتا ہے تو ۹۰ سے ایک پر آجاتے ہیں، تو اس معاملے میں ہمارے ساتھ بھی لڈو کے سانپ والا معاملہ ہو گیا ہے۔ سانپ نے ایسا ڈسا کہ ہم زیرو پر آ گئے۔ ہم آخری مرحلے پر پہنچ چکے تھے لیکن اٹھارہ سال پہلے کی پوزیشن میں آ گئے۔ میں طریقہ واردات بتا رہا ہوں اس طبقے کا جو اسلام کی نفی بھی نہیں کرتا لیکن اسلام پر عمل بھی نہیں کرنا

چاہتا، وہ کیسے کیسے حیلے اختیار کرتا ہے۔ سپریم کورٹ نے وفاقی شرعی عدالت کو کیس واپس بھیج دیا کہ دوبارہ غور کرو۔ جس بینچ نے فیصلہ کیا تھا اس کے ایک جج صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ نے کیا کیا۔ فیصلے کو غلط کہا ہے؟ اس نے کہا ہم نے فیصلے کو غلط کہہ کر کافر نہیں ہونا تھا، ہم مسلمان ہیں، لیکن اس فیصلے کو روکنا بھی تھا، تو ہم نے اسے غلط بھی نہیں کہا اور روکنے کے لیے واپس بھیج دیا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اسلام کی بات بھی کرتا ہے اور کوئی چیز وارا کھاتی ہو اسے تسلیم بھی کر لیتا ہے، لیکن اسلام کو بطور نظام کے قبول کرنے کو تیار نہیں، جس سے ان کا سسٹم متاثر ہو۔

چند سوالات اور جوابات

سوال: ۱۹۷۳ء کا آئین جس میں بائیس نکاتی ایجنڈا نفاذِ اسلام کے لیے تھا، اس کے لیے اگر سیاسی آئینی جدوجہد کی جائے یعنی ۱۹۷۳ء کا آئین مکمل نافذ ہو تو کس حد تک اسلامی نظام اور نفاذِ شریعت ممکن ہے؟

جواب: بائیس نکات علماء کے تھے وہ الگ ہیں وہ ہماری بنیاد ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس میں سے بہت سی چیزیں شامل ہوئی ہیں، بہت سی چیزیں شامل نہیں ہوئیں۔ ۱۹۷۳ء کا دستور الگ چیز ہے اور بائیس نکات اس سے مختلف چیز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں جو گارنٹی موجود ہے:

1. ایک قراردادِ مقاصد،
2. اور دوسرا وہ دفعات کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے قوانین کو نافذ کرنے کی پابند ہے اور قرآن و سنت سے متصادم قانون سازی نہیں کر سکتی،

ان کی بنیاد پر اگر ملک کی تمام دینی جماعتیں متحد ہو کر کام کریں تو حل نکالا جا سکتا ہے۔ جس مسئلے پر ہم متحد ہو کر کوئی کام کرتے ہیں اس میں ہمیں کامیابی مل جاتی ہے۔ متحد ہونے سے مراد تمام مکاتبِ فکر جو بھی پاکستان میں دین کی بات کرتے ہیں کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمارا ماضی کا تجربہ یہ ہے کہ جس مسئلے پر ہم نے متفقہ بات کی ہے اس میں ہم نے کامیابی حاصل کی ہے، اور جب بکھرے ہیں تو وہ ہماری پہلی کامیابی بھی مشکوک ہو گئی ہے۔ اگر متفقہ سیاسی جدوجہد ہو تو دستور میں بنیاد موجود ہے کہ ملک کے نظام کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہوں، متحد ہوں اور ہمارا اتحاد وقتی نہ ہو بلکہ مستقل ہو اور ملک میں نفاذ شریعت کے لیے ہو۔

سوال: موجودہ دور میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے خلافت کے لیے جدوجہد کی۔ ابھی جو موجودہ جید علماء کرام ہیں وہ خلافت کی بات نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: وہی طالبان والی بات ہے کہ علماء خلافت کا ٹائٹل استعمال نہیں کرتے لیکن ہدف وہی ہے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ آپ ان کو خلافت کا منکر کہہ دیں۔ ان کا ہدف وہی ہے لیکن ٹائٹل استعمال نہیں کر رہے کہ وہ زیادہ جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے۔ خلافت پر میرے پندرہ بیس لیکچر ہیں جو نیٹ پر موجود ہیں کہ خلافت ہماری ضرورت ہے۔

سوال: موجودہ صورتحال میں ہم خلافت کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

جواب: جیسے تحریکیں کام کر رہی ہیں کہ شعور اور بیداری پیدا کریں۔ پہلا درجہ بیداری کا ہے اور دوسرا درجہ بیزاری کا ہے۔ صرف بیداری کام نہیں کرے گی، بیزاری بھی پیدا کرنی ہوگی، اس کے بعد تشکیل ہوگی۔ ابھی ہم بیداری کے مرحلے میں ہیں، ابھی ننانوے فیصد لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ خلافت کیا چیز ہے؟ اس کا فائدہ کیا ہے، نقصان کیا ہے؟

سوال: آپ کے خیال میں اگر کوئی بندہ خلافت کا نظام لانے کی کوشش کرے۔ اس کا ایک طریقہ مولانا مودودیؒ نے دیا ہے کہ نظام کے اندر آئے اور دوسرا ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے دیا ہے کہ انقلاب کے ذریعے۔ کیا ان دونوں میں سے کوئی اختیار کرنا چاہیے یا کوئی تیسرا طریقہ بھی ہے؟

جواب: انقلاب کے یہ دو ہی راستے ہیں۔ آپ کے پڑوس میں ایران نے انقلاب لایا ہے، غلط صحیح کی بات نہیں کر رہا، لیکن ایران کے علماء نے فوج سے جنگ نہیں لڑی بلکہ انہوں نے تعلیم اور رائے عامہ کی دو قوتیں منظم کی ہیں اور ان کے زور پر آئے ہیں۔ یہ اگر شیعہ کر سکتے ہیں تو سنی کیوں نہیں کر سکتے۔ ایرانی انقلاب پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ۱۹۸۷ء میں علماء کا ایک وفد ایران کے دورے پر گیا، جس میں سترہ اٹھارہ آدمی تھے۔ حافظ حسین احمد، میں، اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ بھی اس میں تھے۔ آیت اللہ جنتی ایران کے بڑے لیڈر تھے ان کے ساتھ ہماری مجلس تھی۔ انہوں نے ہم سے سوال کیا جو بڑا اہم ہے، انہوں نے کہا کہ خمینی صاحب کو شاہِ ایران نے قم سے جلاوطن کیا تھا، سترہ سال کے بعد ہم ایران میں فاتحانہ داخل ہوئے اور شاہِ ایران کو بھاگنا پڑا۔ آیت اللہ جنتی نے ہمیں کہا کہ آپ کو پینتیس سال ہو گئے ہیں، آپ پاکستان میں کیا کر رہے ہیں؟ یہ علماء کے وفد سے سوال کیا جو چبھتا ہوا سوال تھا کہ آپ کے ہاں کوئی عالم خمینی نہیں بن سکتا؟

ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی جو کہ اسلامی یونیورسٹی کے پروفیسر رہے ہیں وہ ہمارے گروپ لیڈر تھے، میں نے ڈاکٹر صاحب کو اشارہ کیا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ میں نے آیت اللہ جنتی صاحب سے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے پاس بھی دو ایسے قائد تھے جو خمینی کی طرح انقلاب لا سکتے تھے۔ ۱۹۷۷ء

کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے بعد ساری قوم سڑکوں پر تھی، اس وقت اگر مفتی محمودؒ آگے بڑھتے اور شاہ احمد نورانیؒ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو مفتی محمودؒ خمینی تھے۔ اور اگر نورانی صاحبؒ آگے بڑھتے اور مفتی صاحبؒ بیعت کر لیتے تو نورانی صاحب خمینی تھے۔ ہمارے پاس دو ایسے لیڈر تھے اور ہمارا یہی المیہ ہے کہ دو تھے۔ میں نے کہا میں اس تحریک کا حصہ ہوں، اس وقت بالکل یہی پوزیشن تھی، دونوں شخصیتیں اس پایہ کی تھیں کہ اگر ایک آگے بڑھتا اور دوسری شخصیت اس کے پیچھے اقتدا کر لیتی تو انقلاب آ جانا تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ تمہارے پاس ایک تھا اور ہمارے پاس دو تھے۔

سوال: اسٹیبلشمنٹ کی حقیقت کیا ہے اور پاکستان میں اس کا کردار کیا ہے؟

جواب: اسٹیبلشمنٹ سے مراد وہ طبقے ہیں جو رول کر رہے ہیں، ملک کا اقتدار جن کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ملک کی اسٹیبلشمنٹ جرنیلوں، بیوروکریسی اور ملک کے بڑے بڑے جاگیرداروں پر مشتمل ہے، جن کا پورا گروپ ہے جس کو رولنگ کلاس کہتے ہیں یعنی ملک میں حکومت کرنے والی کلاس۔ ان کا ایجنڈا واضح ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی راہ میں کیا رکاوٹ ہے؟ تو میں کہوں گا کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے یہاں اسلام نافذ نہیں ہو سکتا:

1. ایک بڑی رکاوٹ ہمارا مختلف مکاتب فکر کا کوئی مستقل اتحاد اور مستقل ایجنڈا نہ ہونا ہے،
2. اور دوسری بڑی رکاوٹ اسٹیبلشمنٹ ہے جو یہاں کوئی کام ہونا بھی ہوتا ہے تو وہ اس کو نہیں ہونے دیتی۔